منفرد اور چونکا دینے والی کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

شاہین ڈائجسٹ

سلانوالی، سرگودھا

فروری 2017



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ماہنامہ

شاہین ڈائجسٹ

MONTHLY

Shaheen Digest

جلد نمبر 1 | فروری 2017ء | شمارہ نمبر 2

February, 2017

القرآن

اور ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ بھی حق کے ساتھ اترا۔ ہم نے آپ کو صرف خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لئے اتارا ہے کہ آپ اسے بہ مہلت لوگوں کو سنائیں اور ہم نے خود بھی اسے بتدریج نازل فرمایا۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۰۴۔۱۰۶)

الحدیث

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں (کہ جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) مکھی گر پڑے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پوری مکھی کو غوطہ دے اور پھر نکال کر پھینک دے کیونکہ اس (مکھی) کے دونوں پروں میں سے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے پر میں بیماری ہے۔ (بخاری و مسلم)

آئینہ

خط و کتابت کا پتہ:

الدیوان چارپائی سٹور، کچہری موڑ، تحصیل سلانوالی، ضلع سرگودہا، پنجاب، پاکستان

Shaheendigest786@gmail.com

خطوط

آصف ریاض بھٹی جہلم سے،آج کل فیس بک پر کافی ڈائجسٹوں کے اشتہارات دکھائی دے رہے ہیں۔جو کہ آن لائن چلائے جارہے ہیں۔اجالا ڈائجسٹ،الف ڈائجسٹ،داستان دل اور شاہین ڈائجسٹ وقتاً فوقتاً سب کا مطالعہ کرر ہا ہوں لیکن یقین مانیے شاہین ڈائجسٹ کو سب ڈائجسٹوں سے بہتر پایا۔باقی ڈائجسٹ بھی اپنی مثال آپ ہیں لیکن شاہین ڈائجسٹ کی کیا ہی بات ہے۔ملک این اے کاوش اعوان (بانی و چیف ایڈیٹر) محمد خالد شاہان (مینجنگ ڈائریکٹر) یہ وہ لوگ ہیں۔جنہیں میں عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔میں پندرہ بیس سال سے خوفناک ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں اور ان دونوں رائٹرز کو پیہم پڑھتا چلا آرہا ہوں۔دونوں ہی قابل عزت اور تعریف ہیں۔شاہین ڈائجسٹ کے پہلے شمارے کی کامیاب اشاعت پر شاہین ڈائجسٹ کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ایڈیٹر محمد ندیم عباس میواتی صاحب بھی اچھا کام کرر ہے ہیں۔بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔فیس بک پر بھی ان کی ٹیم ہمہ تن جوش ورک کرر ہی ہے۔شاہین ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ کب تک اپلوڈ کر دیا جائے گا؟شدت سے انتظار رہے گا۔والسلام!

☆☆آصف ریاض بھٹی صاحب:حوصلہ افزائی کا شکریہ۔یہ آپ لوگوں کی چاہت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس سٹیج تک پہنچے ہیں۔امید ہے کہ آپ پر مانینٹ ہمارا ساتھ دیں گے۔انشاءاللہ بفضل خدا شاہین ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ پندرہ سے بیس تاریخ کے اندر اپلوڈ کر دیا جائے گا۔شکریہ۔

رانا مقصود احمد پاکپتن سے،السلام علیکم!شاہین ڈائجسٹ کا پہلا شمارہ کافی اچھا تھا۔سب رائٹرز نے اپنے اپنے قلم کے کمالات دکھائے۔سب ہی تعریف کے قابل ہیں۔دعا ہے کہ آپ کا ڈائجسٹ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔آمین۔والسلام۔

☆☆رانا مقصود احمد صاحب:والسلام!دعاؤں میں یاد رکھنے کا بہت شکریہ۔

ڈاکٹر ارسلان احمد سرگودہا سے،السلام علیکم!میں سرگودھا ڈاکٹر طیب حسین اعوان کے ہسپتال میں لیبارٹری ٹیکنیشن ہوں۔علاوہ ازیں مبارک ہسپتال اور سٹی ہسپتال میں بھی جاب کرر ہا ہوں۔ادب کی دنیا سے بہت پرانا تعلق ہے اور پھر اچھے رائٹرز کے ساتھ تو ہمیشہ سے ہی تعلق رہا ہے۔آپ کا شمارہ قابل تعریف ہے۔اگر اسی طرح محنت کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں

جب آپ کے ڈائجسٹ کا نام واقعی پوری دنیا میں گردش کرے گا۔سب رائٹرز نے بہت اچھا لکھا تھا۔خاص کر مجید احمد جائی اور علی حسنین تابش قابل تعریف ہیں۔خالد شاہان خوفناک کہانی کے ساتھ حاضر ہوئے تھے۔اچھی کہانی تھی۔طاہر عباس کی کہانی بھی پسند آئی۔باقی رائٹرز نے بھی اچھا لکھا تھا۔اگلے شمارے کا منتظر ہوں۔والسلام!

☆☆☆ڈاکٹر ارسلان احمد صاحب: آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے ڈائجسٹ کو عزت بخشی۔یہ آپ جیسے عزیز دوستوں کی مہربانیوں اور محبتوں کا ثمر ہے کہ آج ہم لوگ اس مقام پر ہیں۔جب تک آپ جیسے اچھے لوگ ادب کی دنیا سے بالواسطہ یا بالواسطہ منسلک ہیں۔یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں سکتا۔امید ہے کہ محبت نامہ ہمیشہ موصول ہوتا رہے گا اور من فکر ہو جائیے اگلا شمارہ بھی انشاءاللہ بفضلِ خدا جلد ہی آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔

غلام یسین نوناری ،السلام علیکم! شاہین ڈائجسٹ کی پہلی اشاعت پر سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔تمام لکھنے والوں کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا اور اپنی ٹیم کا بھی شکرگزار ہوں کہ اچھے برے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تنقید و تعریف کی پرچھائیوں میں اپنی محنت جاری رکھتے ہوئے پہلا شمارہ منظر عام پر لائے۔انشاءاللہ فروری کے شمارے میں ہر خامی کو دور کرنے کی سعی کی جائے گی جو کہ جنوری کے شمارے میں دور نہ کی جاسکیں۔والسلام۔

☆☆برادر محترم: وعلیکم السلام! میں اور میری پوری ٹیم آپ لوگوں کے تعاون کی ازحد مشکور ہے۔آپ لوگوں نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا۔آپ کو یکسر فراموش کر دینا ہماری عادت نہیں ہے۔ہم مشکور ہیں آپ کہ آپ نے اور آپ کی ٹیم نے بھی ہمارے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا اور یہ تعاون جاری و ساری رہے گا۔انشاءاللہ۔

ضروری اعلان

السلام علیکم! آن لائن ماہنامہ شاہین ڈائجسٹ کی ٹیم کی باہم مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ شاہین ڈائجسٹ کو سہ ماہی بنایا جائے۔اس طرح دو چار نہیں بلکہ درجنوں رائٹرز کو لکھنے کا موقع درکار ہوگا۔سہ ماہی شاہین ڈائجسٹ کے صفحات میں کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے لیکن نئے پرانے سب رائٹرز کو اس میں جگہ دی جائے گی۔کچھ دوستوں کے گلے شکوے ملے تھے کہ ان کی کہانیاں ڈائجسٹ میں نہیں لگ سکیں۔اس لیے تمام دوستوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارا اگلا شمارہ مئی 2017 کو اپلوڈ کیا جائے گا۔اس لیے جلد سے جلد کہانیاں ارسال کی جائیں تا کہ سب دوستوں کو جگہ دی جا سکے۔مزید معلومات کے لیے کسی بھی وقت رابطہ کریں۔والسلام!

محمد ندیم عباس میواتی (ایڈیٹر شاہین ڈائجسٹ)

0334-7284018 / 0304-817478 / 0306-9034595

بولتی تصویر



بولتی تصویر

تحریر: حافظ محمد بلال اسلم......سلانوالی، سرگودہا

شاهان کوبچپن سے هی پرانی چیزیں اکٹھی کرنے کااشتیاق تھا۔پورے گھرمیں جگه جگه اس کی اکٹھی هوئی چیزیں ملتی تھیں۔کاوش کاتعلق ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔شاهان کے والد صاحب اپنابزنس کرتے تھے۔اس کے دوبھائی تھے۔دونوں هی اپنے اپنے کام میں مشغول تھا۔ایک وہ تھاکه اسے صرف ایک هی کام پسندتھا۔اوروہ تھا پرانی اشیاء کواٹھاکر گھرمیں لانا۔

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

’’رک جاؤ شاہان۔‘‘ بنا آواز نکالے زینہ عبور کرتے کاوش کو پیچھے سے اس کی ماں نے پکارا۔

’’آخر تم نے اس گھر کو سمجھ کیا لیا ہے۔ یہ گھر ہے کوئی کباڑ خانہ نہیں کہ تمہیں جو چیز بھی ملے اٹھا کر یہاں لے آتے ہو۔‘‘

شاہان کو بچپن سے ہی پرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا اشتیاق تھا۔ پورے گھر میں جگہ جگہ اس کی اکٹھی ہوئی چیزیں ملتی تھیں۔ کاوش کا تعلق ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ شاہان کے والد صاحب اپنا بزنس کرتے تھے۔ اس کے دو بھائی تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے کام میں مشغول تھا۔ ایک وہ تھا کہ اسے صرف ایک ہی کام پسند تھا۔ اور وہ تھا پرانی اشیاء کو اٹھا کر گھر میں لانا۔

اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں قد آدم پرانی تصویر تھی۔ یہ تصویر کسی نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ کی تھی۔ جو مسہری پر ٹیک لگائے براجمان تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا ایک کپ بھی تھا۔ مسہری کے ایک طرف چھوٹا سا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی پانی کا ایک جگ اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ مسہری کے عین اوپر ایک چھوٹی سی تصویر تھی جس میں ایک چھوٹا سا تلاب دکھایا گیا تھا۔ اس تلاب میں ایک کشتی جسے ایک نوجوان چپوؤں کے سہارے چلا رہا تھا۔ دکھایا گیا تھا۔

اس تصویر کو بنانے والے نے ہر وہ رنگ بھر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تصویر اپنے وقت کی ایک نایاب تصویر جانی گئی ہوگی۔ لیکن آج یہ تصویر شاہان کو اس کے ایک دوست کے کباڑ خانے سے ملی تھی۔ شاہان نے اپنے شوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے شہر کے تین چار بڑے بڑے کباڑیوں سے مراسم بنا لیے تھے۔ جب بھی کوئی پرانی اور نایاب چیز ان کے پاس آتی تو فوراً سے بھی پیشتر شاہان کو کال کرکے مطلع کرتے تھے۔ اور شاہان دیوانہ وار ان کے پاس جا پہنچتا۔

''ماں دیکھئے تو کتنی پیاری تصویر ہے یہ۔'' شاہان نے دونوں ہاتھوں سے جکڑی اس تصویر کا رخ ماں کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کمرے میں ایسی کاٹھ کباڑ کی چیزیں رکھنی کی مزید کوئی گنجائش ہے کیا؟''شاہان کی ماں نے سر تھام کر صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ماں جگہ ہو یا نہ ہو۔اس نے کونسا جگہ گھیرنی ہے۔اسے تو دیوار پر لگا دوں گا۔'' شاہان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''آنے دو ایک بار آج تمہارے ابو کو اگر سارا کاٹھ کباڑ نہ نکلوا کر پھینکا تو پھر کہنا۔''شاہان کی ماں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

جواباً شاہان مسکراتا ہوا تصویر لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔گھر کے سارے ہی افراد اس کی ان حرکتوں سے تنگ آ چکے تھے۔اس کے والد اور بھائیوں نے بارہا چاہا کہ اسے کسی کام پر لگا دیں لیکن مجال ہے اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔

ایک بار تو اس کے بڑے بھائی اللہ بخش اسے زبردستی اپنے آفس میں لے گئے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خود ہی اسے گھر چھوڑ گئے۔ شاہان کے بھائی اللہ بخش کا کنسٹرکشن کا کام تھا۔ہوا یوں کہ وہ اسے آفس میں بٹھا کر اپنے جاری پروجیکٹس کو دیکھنے گیا۔ پیچھے سے کسی ٹھیکیدار کی کال آئی اور اس نے بتایا کہ مزدور لوگ اسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ان کو معاوضہ کم دیا جاتا ہے۔ان کے معاوضے میں بڑھوتری کی جائے۔

شاہان نے فوراً لہجہ بدلا اور بھائی کی آواز نکالتے ہوئے بولا:

''تو تم ان کے معاوضے میں بڑھوتری کیوں نہیں کر رہے؟''

شاہان کے سوال پر ٹھیکیدار کلبلا کر رہ گیا۔''سر آپ نے خود ہی تو ان کے معاوضے کی لسٹ تیار کر کے بھجوائی تھی۔بھلا میں کہاں ان میں کمی بیشی کر سکتا ہوں۔''

ٹھیکیدار نے اضطرابیت سے جواب دیا۔اسے شاہان کی بات پر شدید غصہ آ رہا تھا۔اس کا اندازہ شاہان کو اس کے بولنے سے ہی ہو گیا تھا۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔زیادہ وضاحتیں نہ دو مزدور لوگ جتنی کہتے ہیں ان کے معاوضے میں اتنی بڑھوتری کر دو۔''شاہان نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن سر اس طرح تو۔''ٹھیکیدار ہکلاتے ہوئے بولا۔لیکن اس کے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی شاہان نے اسے ٹوک دیا۔

''کیا لیکن ویکن کیے جا رہے ہو۔سمجھ نہیں آ رہی کیا تمہیں۔لگتا ہے ٹھیکیداری سے ہٹانا پڑے گا۔جو کہا ہے وہ کرو۔''

اس کا جواب سنے بنا ہی شاہان نے کال منقطع کر دی۔عین اس وقت جب وہ کریڈل پر ہاتھ دھرے زیرلب مسکرائے جا رہا تھا۔اس کے بھائی اللہ بخش کی سیکرٹری اس کے روم میں داخل ہوئی۔

شاہان نے اسے نگاہ بھر کر دیکھنا شروع کر دیا۔سیکرٹری اس کے دیکھنے کے انداز سے جھینپ سی گئی تھی۔وہ کسی کام سے آئی تھی لیکن اس کی تو جیسے زبان ہی گنگ رہ گئی تھی۔اس کے مائنڈ میں یہی تھا کہ اندر آفس میں شاہان کا بھائی براجمان ہوگا لیکن شاہان کو دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا ہوگئی تھی۔

''آیئے بیٹھئے نہ۔''شاہان نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نہ چاہتے بھی سیکرٹری کو اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑ گیا۔

''فرمایئے۔کیسے آنا ہوا میرے آفس میں؟''

''سر میں اللہ بخش صاحب کی سیکرٹری ہوں۔''سیکرٹری نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھ دی۔

''سر میرا نام رخسانہ ہے۔''

''ارے واہ۔اتنی خوبصورت دوشیزہ اور وہ بھی میرے بھائی کی سیکرٹری۔''شاہان زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''سر آپ نے کچھ کہا؟''سیکرٹری نے پوچھا۔

''ہاں۔نہیں وہ میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ میرے بھائی کی سیکرٹری ہیں تو میری بھی سیکرٹری ہوئی ناں۔''شاہان کی وہیل چیئر سے ٹیک لگا کر جھولتے ہوئے کہا۔

''آف کورس سر۔''سیکرٹری نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''تو آپ کے ذمہ اس کمپنی کے کون کون سے کام ہیں؟''شاہان نے آگے ہو کر دونوں ہاتھوں کی کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں جماتے ہوئے پوچھا۔

''سر میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔اگر فوراً اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو کوئی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔''سیکرٹری نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنے آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا بھی کونسا کام ہے۔کیا کوئی عفریت نازل ہوگئی ہے؟''شاہان غصے سے پیچ وتاب کھا کر بولا اور دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آگے پیچھے جھولنے لگا۔

''اللہ بخش صاحب نے جس پروجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔اس پروجیکٹ پر کام کرنے والے ملازموں نے ہڑتال کر دی ہے۔یہی نہیں انہوں نے ٹھیکیدار کی بھی اچھی خاصی درگت لگائی ہے۔اللہ بخش صاحب کال پک نہیں کر رہے۔ایسا نہ ہو کوئی بڑی مصیبت سامنے آجائے۔''سیکرٹری نے پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔

''ارے تم اتنی چنتا کیوں کر رہی ہو۔یہ کام میرے بھائی کا ہے وہ خود ہی سنبھال لے گا۔تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ابھی تک سنگل

ہو یا سنگل ہی ہو؟'' شاہان نے اس سے پوچھا۔

شاہان کے سوال پر سیکرٹری حیران وششدر رہ گئی۔ ایک طرف اس کے بھائی کا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف یہ صاحب بہادر اس کا بائیو ڈیٹا پوچھنے پر تلا ہوا تھا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور شاہان کا بھائی اللہ بخش غصے سے پیچ و تاب کھاتا اندر داخل ہوا۔

''مجھے یہ بتاؤ ٹھیکیدار انعام کو تم نے کہا ہے کہ مزدوروں کے معاوضے میں بڑھوتری کر دو؟'' اللہ بخش نے اندر داخل ہوتے ساتھ پوچھا۔

اس سے قبل کہ شاہان اس کی بات کا کوئی جواب دیتا اس کا بھائی سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔

''اور تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ کتنی پرابلم پیدا ہو چکی ہے۔ مزدوں نے نہ صرف ہڑتال کر دی ہے بلکہ ٹھیکیدار انعام کو بری طرح سے زدوکوب بھی کیا ہے؟''

اللہ بخش کی بات سن کر اس سے قبل سیکرٹری کوئی جواب دیتی۔ شاہان بول پڑا۔

''ارے بھائی جان کیا اتنی خوبصورت دوشیزہ سے ایسے بات کرتے ہیں۔ دیکھیئے تو اس کے چہرے کی سرخی ماند پڑنے لگی ہے۔''

شاہان کی بات سن کر جہاں سیکرٹری حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گئی وہیں اس کا بھائی بھی اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورنے لگا۔

''تم جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟'' شاہان کے بھائی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری کال پر اس نے مزدوروں کو کچھ بتائے بنا میرے سیل فون پر رابطہ کر کے دوبارہ کنفرم کیا اور جب ساری بات اس نے مجھے بتائی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ اس سے قبل کہ وہ مزدوروں کو کوئی جواب دیتا انہوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ جب میں نے اسے آرڈر دے دیا ہے کہ وہ ان کے معاوضے میں بڑھوتری کر دے تو آپ نے منع کیوں کیا۔ اس کی موت کے یا اس پر ڈھائے گئے مظالم کے ذمہ دار تو آپ ٹھہرے۔'' شاہان نے بھائی کی بات کا جواب دیا۔ پھر سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔

کیا نام بتایا تھا تم نے (ذہن پر زور دیتے ہوئے) ہاں رخسانہ۔ تم چپ کیوں بیٹھی ہو۔ بتاؤ اب قصور میرا ہے یا میرے بھائی کا۔ ارے تم چنتا مت کرنا آج سے میں بھی تمہارا باس ہوں۔''

''جسٹ شٹ اپ۔'' اس کا بھائی غصے سے تلملا کر بولا۔

''ابھی اٹھو اور چلو میں تمہیں گھر پہنچا کے آؤں تم ایک منٹ بھی مزید یہاں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو۔''

''اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ابھی تو ہماری گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔'' شاہان نے جواباً نرم لہجے میں کہا اور ایک بار پھر سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔

''اچھا آپ کے پاس موبائل تو ہوگا۔کس کمپنی کانیٹ ورک یوز کررہی ہیں آپ۔آئی مین کہ جاز، ٹیلی نار، یوفون،وارد یا پھر زونگ۔چلیے اپنا نمبر دے دیجئے جو بھی نیٹ ورک ہوا کام چلا لیں گے۔''

سیکرٹری اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔اس کا من کررہا تھا کہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے لیکن پھر غصے سے پیر پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔جبکہ اس کے بھائی نے اس کے بازو سے پکڑا اور تقریباً دھکیلتا ہوا آفس سے باہر لے آیا۔

اس کے بھائی کے آفس کے ساتھ ہی سیکرٹری کا کمرہ تھا۔جاتے جاتے اس نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور زور سے بولا:

''میں پھر آؤں گا انتظار کرنا۔''

اس کے بھائی نے اور زور سے اس کا بازو تھاما سرعت سے اسے گاڑی میں لا بٹھایا۔جلد ہی وہ اسے گھر چھوڑ کر چلتا بنا۔جاتے جاتے اس نے ماں کو ساری بات سے آشنا کیا اور بتایا کہ اس کی وجہ سے اسے ایک وقت میں کیسے دو دو پریشانیوں سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔

☆......☆......☆

شاہان نے اس تصویر کو اپنے بیڈ کے بالکل اوپر لگا دیا تھا۔تصویر والی لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ شاہان کی نگاہیں اسی پر ٹکی کی ٹکی رہ گئیں۔یوں اسے کمرے میں لیٹے ہوئے تقریباً دن بیت گیا۔اور یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا جب وہ یوں اتنی دیر تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔

اس کے بھائیوں اور والد صاحب کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔اس کی والدہ کو اس کی چنتا ہونے لگی تھی کہ اس سے پہلے تو اس نے اتنا وقت کبھی بھی اپنے کمرے میں نہ گزارا تھا۔یہی سوچ کر اس کی والدہ کچن سے باہر نکلی اور زینہ عبور کرتی ہوئی اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

اگلا منظر دیکھ کر اس کی والدہ حیران و ششدر رہ گئی تھی۔شاہان ٹکٹکی باندھے بیڈ کے اوپر لگی تصویر کو دیکھے جارہا تھا۔اس کی والدہ نے ایک سرسری نگاہ اس تصویر پر ڈالی لیکن اسے اس تصویر میں سوائے اس بات کے کہ ایک لڑکی مسہری پر چائے کا کپ پکڑے پاؤں پھیلائے براجمان تھی کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔

شاہان کی والدہ نے حیرت سے اپنے پسر کو دیکھا اور سوچا کہ کہیں یہ اس تصویر والی لڑکی کو جانتا تو نہیں اور ایسا تو نہیں کہ یہ تصویر اس نے خود بنوا کر اپنے کمرے میں لگائی ہو۔اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ ٹھٹکی اور آگے بڑھ کر شاہان کو زور سے ہلایا۔

شاہان جومجنوں کی سی حالت میں دنیاو مافیا سے بے خبر اس تصویر کو تکے جا رہا تھا۔ یوں آناً فاناً جھنجھوڑے جانے پر چونک گیا۔ اور سرعت سے اپنی جگہ بیٹھ کرادھرادھر دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے اس کی مبہوت کھڑی والدہ اسے گھورے جا رہی تھی۔

''شاہان یہ سب کیا ہے؟'' اس کی والدہ نے تلخ و شیریں لہجے میں پوچھا۔

''کک ...... کچھ نہیں امی ...... کیوں کیا ہوا؟'' شاہان اپنی والدہ کے سوال پر سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''کون ہے یہ لڑکی؟'' اس کی والدہ نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی تصویر جب سے تم نے کمرے میں لگائی ہے تم اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں آئے؟''

شاہان کے پاس اپنی ماں کے کسی سوال کا کوئی جواب ہوتا تو دیتا۔ اس نے چپ سادھے رکھی۔

''ابھی اتارو اس تصویر کو اور پھینک آؤ کہیں۔ وگرنہ تمہارے ابو اور بھائیوں کو کہلوا کر اسے باہر پھینکوا دوں گا۔''

''ماں آپ بھی نہ؟'' بالآخر شاہان نے تنگ کر کہا۔ ''اس تصویر کے میرے کمرے میں ہونے سے کونسا کوئی مصیبت آ جائے گی۔ یہ تصویر ہی ہے نہ کوئی لڑکی تو نہیں جسے اٹھا کر میں نے کمرے میں لٹکا دیا ہے۔''

''لیکن جب سے تم اس تصویر کو لے آئے ہو تم اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے'' شاہان کی والدہ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو آپ کو اور کیا چاہیے۔ آپ کسی بات سے خوش بھی ہوتی ہیں۔ کبھی آپ کا اعتراض ہوتا ہے کہ گھر میں نہیں بیٹھتا اور اگر آج گھر میں رہا ہوں تو اب آپ کا اعتراض ہے کہ میں گھر میں کیوں رہا ہوں۔'' شاہان نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا۔

''اگر گھر میں رہتے تو ایسی بات کیوں کرتی تم اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئے وہ بھی صرف ایک تصویر کی خاطر۔ ایسی بھی کیا خاص بات ہے اس تصویر میں ہمیں بھی بتاؤ ہم سب گھر والے تمہارے ساتھ اس کمرے میں مقید ہو جائیں گے۔'' اس کی ماں جواباً غصے سے بولی اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

''اے کاش تم تصویر کی جگہ حقیقت میں لڑکی ہوتی اور مجھ سے گفت وشنید کر سکتی۔ میں دل کی باتیں تم سے کر سکتا۔'' شاہان بیڈ پر ایستادہ ہو کر اس تصویر کو بغور دیکھ کر بولا۔

پھر بیڈ سے نیچے اتر گیا۔ اور باہر جانے کے لیے دروازے کی سمت چل پڑا۔ عین اس وقت اس تصویر کی آنکھیں اس کی پشت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اور جب تک وہ کمرے سے باہر نہ نکلا اس تصویر کی آنکھیں اسی پر مرکوز رہیں۔ اگر شاہان اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیتا تو حواس باختہ ہو جاتا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ساتھ ہی تصویر کی آنکھیں دوبارہ اپنی جگہ ٹک گئیں۔

☆......☆......☆

شاہان اس وقت بازار سے سوداسلف خرید رہا تھا۔ جب اس کے ایک کباڑیے دوست کی کال آئی۔ اس نے پہلی ساعت میں تو کال ریسیو نہ کی لیکن جب موبائل کی گھنٹی نے دوسری بارا سے متوجہ کیا تو اس نے موبائل کان سے لگالیا۔

''کیسے ہو شاہان؟'' کال ریسیو کرتے ساتھ ہی کباڑیے دوست کی بازگشت نے اس کی سماعت پر دستک دی۔

''ٹھیک ہوں تم سناؤ؟'' شاہان نے سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کہاں ہوتے ہو یار اب تو چکر بھی نہیں لگاتے جانتے ہو کتنی نایاب چیزیں میں نے جمع کر رکھی ہیں تمہارے لیے۔''

''نہیں دوست اب مجھے مزید کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے ایک ایسی نایاب چیز مل چکی ہے کہ مزید کسی نایاب یا پرانی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔'' شاہان نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ایسی بھی چیز مل گئی ہے تمہیں شاہان؟'' اس کباڑیے نے حیرت سے پوچھا۔

''چھوڑو ان باتوں کو۔'' شاہان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کام کیسا چل رہا ہے؟''

''بہت اچھا چل رہا ہے دوست۔ تمہارے لیے نایاب چیزوں کا انبار لگا کے رکھا تھا لیکن تم لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔'' کباڑیے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''آج کل مجھ پر پابندی لگا دی گئی ہے کہ اگر دوبارہ گھر میں کچرہ لائے تو گھر میں موجود ساری چیزیں باہر پھینک دی جائیں گی۔'' شاہان نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''شور بہت ہے تمہارے پاس شاہان کہاں ہو تم؟'' کباڑیے نے گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں سن کر پوچھا۔

''میں بازار سے گھر کا کچھ سودا سلف خریدنے آیا تھا۔ اور اب واپس جا رہا ہوں۔'' شاہان نے جواب دیا۔

''کیا تم میرے پاس سے ہوتے جاؤ گے؟'' کباڑیے نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' شاہان نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں گھر کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں اور پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مزید تھوڑی سی دیر بھی ہوگئی تو فون پہ فون آنا شروع ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے دوست جیسے تمہاری مرضی لیکن میں پھر بھی تمہارے لیے ان چیزوں کو سنبھال کر رکھوں گا۔'' کباڑیے نے کہا۔

''جیسے ہی وقت ملا میں ضرور آؤں گا دوست۔'' شاہان بولا۔ پھر دونوں کے درمیان دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور کال منقطع ہوگئی۔

کال منقطع ہوتے ساتھ ہی شاہان نے موبائل ڈیش بورڈ پر رکھا اور گاڑی سپیڈ بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد اپنی تصویر والی محبوبہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

شاہان بالکل ہی دیوانہ ہو چکا تھا۔ اسے ایک تصویر سے عشق ہو گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تصویر کسی کیمرے وغیرہ سے

نہیں بنائی گئی بلکہ کسی مصور کی قلم کا کمال تھا اسے اس تصویر سے بے پناہ محبت ہو چکی تھی۔

شاہان گھنٹوں اس تصویر سے باتیں کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس تصویر نے اس کی کسی بات کا کیا جواب دینا ہے۔لیکن ایک امید تھی اس کے سینے میں کہ ایک نہ ایک دن یہ تصویر اس سے ضرور بات کرے گی۔ وہ بھی شاہان سے اپنی محبت کا اظہار کرے گی۔

دوسری طرف شاہان کے گھر والے اس کی اس حالت سے بے حد پریشان تھے۔ایک بار انہوں نے اس تصویر کو اس کے کمرے سے ہٹانے کی سعی کی تھی لیکن شاہان نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر تصویر کو اس کے کمرے سے ہٹایا گیا تو وہ اس تصویر کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ...... بہت دور چلا جائے گا۔اس کے گھر والوں نے چپ سادھ لی تھی۔

اس کی حالت پاگلوں سے بھی ابتر ہو چکی تھی۔ اس کے گھر والے اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھے۔وہ کسی طرح اس تصویر کو اس کے کمرے سے باہر نکلوانا چاہتے تھے لیکن وہ شاہان کی ضد سے بھی آشنا تھے کہ اگر انہوں نے رتی برابر بھی سختی کی تو شاہان حقیقت میں اس گھر کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا جائے گا۔اور یہی بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

ایک شام شاہان اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر دراز اسی تصویر کو تکے جا رہا تھا۔موسم کروٹ بدل چکا تھا۔کالے بادلوں نے آسمان کو چھپا دیا تھا۔بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نے ماحول کی خوفناکیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔شاہان کی آنکھوں میں اتھروبھر آئے تھے۔

شاہان اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔عین اس وقت شاہان کو اس تصویر والی لڑکی پر بہت پیار آیا۔شاہان کی آنکھوں میں اتھرو بھر آئے تھے۔آنسو بھری آنکھوں سے شاہان نے اس تصویر کی طرف دیکھا۔شاہان کو اس تصویر میں کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی۔شاہان دوبارہ بیڈ پر آ کر براجمان ہو گیا۔اس کی نگاہیں بدستور اس تصویر پر مرکوز تھیں۔

''کیا تم کبھی بھی نہیں بولو گی؟'' شاہان نے نم آلود لہجے میں تصویر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''اے کاش کہ تم کبھی بول پڑتی۔میری تنہائیوں کو دور کرتی۔میں تم سے کتنی باتیں کرتا ہوں۔کاش کہ تم بھی مجھے کسی بات کا جواب دے دیتی۔''

''کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟'' شاہان جو سر جھکائے بری طرح سے رو رہا تھا۔اچانک اس کی سماعت سے نسوانی آواز ٹکرائی۔

شاہان نے سرعت سے اس تصویر کی طرف دیکھا لیکن اپنا وہم سمجھ کر سر جھکا لیا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟''

ایک بار پھر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔اب کی بار آواز پہلے سے زیادہ مترشح تھی۔شاہان کو یقین ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی آواز سنی ہے۔اس نے چہار سو نگاہیں دوڑائیں پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں تصویر پر ٹک سی گئیں۔

اسے یوں لگا جیسے تصویر میں بنی لڑکی نے آنکھیں جھپکی ہوں۔شاہان نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں اور بغور اس تصویر والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

''کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں ہو رہا؟''

اب کی بار شاہان کو یقین ہو گیا تھا کہ آواز اسی تصویر والی لڑکی کی ہی ہے کیونکہ شاہان نے اس کے ہونٹوں میں ہوتی جنبش دیکھ لی تھی۔شاہان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا تم واقعی بول سکتی ہو؟''شاہان نے بے یقینی سے اس تصویر کو تکتے ہوئے پوچھا۔

''اگر نہ بول سکتی تو تمہارے سوالوں کے جواب کیسے دیتی۔''ایک بار پھر اس تصویر کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اس نے شاہان کی بات کا جواب دیا۔

''اگر تم بول سکتی تھی تو پہلے کیوں نہ بولی؟''شاہان نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔''میں نے کتنی ہی باتیں تم سے کی تھیں۔اپنے دل کی ہر بات تمہارے سامنے کی تھی۔اس کے باوجود تم نے کسی بات کا جواب دینا بہتر نہ سمجھا تھا۔''

شاہان کا غصہ عروج پر تھا۔اس کی بات سن کر تصویر والی لڑکی زیرلب مسکرا دی تھی۔اس نے ایک محبت بھری نگاہ سے شاہان کو دیکھا۔

''چلو آج تو جواب دے دیا ہے نہ۔''تصویر والی لڑکی نے جواب دیا۔

''کیا تم تصویر سے باہر بھی نکل سکتی ہو؟''شاہان نے پوچھا۔

''ہاں۔''لڑکی نے جواب دیا۔''لیکن اس تصویر سے باہر نکلنے کے لیے بہت کٹھن حالات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔''

لڑکی کا جواب سن کر شاہان حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔اس نے انگشت بدنداں ہو کر اس تصویر والی لڑکی کو دیکھا۔''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟''

شاہان نے کہا۔''مطلب مترشح ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس تصویر کی قید سے آزاد ہو جاؤں تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔''

''کیسا ساتھ؟''شاہان نے پوچھا۔

''کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ میرا ساتھ دو گے؟''تصویر والی لڑکی نے پوچھا۔

''جب تم بول سکتی ہو۔جنبش کر سکتی ہو تو پھر ایسی کونسی خاص بات باقی رہ گئی ہے کہ تم اس تصویر سے باہر نہیں نکل پا رہی؟''شاہان نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر پوچھا۔

''یہ چند برس پہلے کی بات ہے۔جب میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔''تصویر والی لڑکی نے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔اور پھر ایک ایک لفظ شاہان کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کرتا چلا گیا۔شاہان کو اپنی سماعت پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔اس

لڑکی کی کہانی کا ایک ایک لفظ شاہان کے دل پر ثبت ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''مہوش۔''مہوش جو اپنی دھن میں چلی آ رہی تھی اسے پیچھے سے راجو کی بازگشت سنائی دی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔

''کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔ پتہ نہیں تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟''

راجو کی بات سن کر مہوش نے حیرت وغصے کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا۔

''راجو بھلا یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔ سرراہ اگر تم اس طرح مجھے پکارو گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔''مہوش نے غصے سے جواب دیا۔

''تو کیا تم ڈرتی ہو ان لوگوں سے۔ ارے پاگل ہم محبت کرتے ہیں۔''راجو نے مہوش کی بات سن کر جواب دیا۔

''ہاں میں ڈرتی ہوں۔ کیونکہ میں تمہاری طرح لڑکا نہیں ہوں۔ ہم محبت کرتے ہیں تو یہ کوئی کمال نہیں دنیا میں ہر وہ انسان محبت کرتا ہے جو بلوغت کی حدود کو چھوتا ہے۔''مہوش نے جواب دیا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''راجو نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''تم دیکھ رہے ہو نہ کہ ہر کس و ناکس کی نگاہیں ہم پر ہی مرکوز ہیں۔ اب خود سوچو اگر کل کو کوئی ہم پر انگلی اٹھائے تو بے عزتی کس کی ہو گی تمہاری یا میری۔ اور میرے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔''مہوش نے رکتے ہوئے پوچھا۔

اسے رکتا دیکھ کر راجو بھی رک گیا۔ وہ حیرت بھری آنکھوں سے مہوش کو دیکھ رہا تھا جو بات کرتے کرتے اچانک رک گئی تھی۔

''میں اپنے والدین کا سر نیچا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو کل کا سورج طلوع ہونے سے قبل گھر والوں کو بھیج دینا میرے گھر رشتہ مانگنے وگرنہ دوبارہ کبھی بھی میرے راستے میں مت آنا۔ میں اپنی محبت کی قربانی تو دے سکتی ہوں۔ لیکن میرے والدین کا سر نیچا ہو میں یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

مہوش بات مکمل کر کے سرعت سے آگے بڑھ گئی جبکہ راجو اپنی جگہ ساکت وصامت ایستادہ اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ مہوش کی بات ٹھیک ہی تھی۔

راجو نے بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ آج ہی اپنے گھر والوں کو مہوش کے گھر بھیجے گا۔ وہ مہوش کی ضد سے بخوبی آشنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مہوش ایک بار جس بات پر بضد ہو جائے پھر دنیا بے شک ادھر کی ادھر ہو جائے وہ اپنی بات سے نہیں ہٹتی۔

☆......☆......☆

مہوش کو یقین بھی نہیں تھا کہ راجو اپنے گھر والوں کو اس کے ہاں رشتہ مانگنے کے لیے بھیجے گا۔ لیکن ابھی شام کے دھندلکے پوری طرح سے ہر چیز پر قابض نہیں ہوئے تھے کہ راجو کے والدین اور راجو کی بہن اور بہنوئی اس کا رشتہ مانگنے آ گئے۔

مہوش کو یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔وہ راجو کو بھی عام لڑکوں کی طرح ٹائم پاس سمجھتی تھی۔جو وقت گزاری کے لیے اس کے ساتھ مراسم قائم کیے ہوئے تھا۔بے شک آج تک اس نے اسے چھوا تک نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اس کی طرف سے بددل ہی رہتی تھی۔

راجو کے والدین اوراس کی بہن اور بہنوئی کو دیکھ کر مہوش سرعت سے اپنے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں اس کی والدہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آئی تھی۔اتفاق سے مہوش کے سارے گھر والے آج گھر پر تھے۔

کوئی بھی راجو کے والدین کو نہ جانتا تھا لیکن سب ان سے بہتر طریقے سے پیش آئے تھے۔جب انہوں نے آنے کی وجہ بیان کی تو مہوش کے والدین پہلے تو حیران ہوئے پھر اس کی والدہ اس کی رضامندی معلوم کرنے اس کے کمرے میں آئی۔اس وقت مہوش اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز تھی۔یکبارگی اپنی ماں کو کمرے میں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

''بیٹی۔''اس کی ماں نے اس کے پاس بیڈ پر براجمان ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔''تم نے اتنی بڑی بات ہم سے کیوں چھپائے رکھی؟''

ماں کی بات سن کر مہوش نے اضطرابیت بھرے لہجے میں ماں کی طرف دیکھا۔

''چنتا مت کرو۔راجو کے والدین نے ہمیں ساری بات بتادی ہے۔اگر تم بھی ہمیں یہ بات بتا دیتی تو ہم تمہاری بات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے۔لیکن پھر بھی ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ ہماری تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ شرم و حیا نے ہماری دختر کے منہ کو کھلنے نہیں دیا۔''

''امی۔''مہوش خوشی سے سرشار ہو کر ماں کے گلے لگ گئی۔

''میری بچی۔بس میں تمہاری رضامندی پوچھنے آئی تھی۔مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔آگے تمہارا مقدر۔اللہ تمہارا بہتر مقدر بنائے۔''مہوش کی ماں اسے دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

مہوش اور راجو کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔راجو کے والدین نے مہوش کو جلد ہی اپنی بہو بنانے کا کہا تھا۔بھلا مہوش کے والدین کو کیا اعتراض ہوتا۔

☆......☆......☆

راجو شہر کا ایک مشہور مصور تھا۔اس کی مصوری کے چرچے جہاں بھر میں گونجتے تھے۔راجو بے شک کم عمری میں تھا لیکن اس کی مصوری نے اسے بڑی عمروں کے مصوروں سے نایاب کر دیا تھا۔راجو کے نام سے مہوش کے والدین بھی آشنا تھے۔لیکن انہوں نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں تھا۔

یہ ان کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی کہ ان کی دختر کی شادی ایک انٹرنیشنل مصور سے ہونے جا رہی تھی۔

مہوش جو اس وقت اپنے روم میں سنگھار شیشے کے سامنے براجمان بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔اسے اچانک موبائل کی بیل نے

چونکا دیا۔

اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو سکرین پر راجو کا نمبر تھا۔اس نے سرعت سے کال یس کی اور موبائل کان سے لگا لیا۔

''السلام علیکم!''مہوش نے مؤدبانہ لہجے میں سلام دیا۔

''وعلیکم السلام۔''راجو نے اس کے سلام کا جواب دیا۔''کیا تم آج مجھ سے مل سکتی ہو؟''

راجو کے سوال پر مہوش انگشت بدنداں رہ گئی۔''کیوں خیرت تو ہے ناں؟''

مہوش نے پوچھا۔''ہاں خیر یت ہی ہے۔بتاؤ نہ فری ہو کہ بزی؟''راجو نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''فی الحال تک تو فری ہوں۔''مہوش بولی۔

''تو کیا میں آجاؤں۔ایک بہت ہی ضروری کام ہے؟''راجو نے پوچھا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔شام کے اس وقت تم میرے گھر میں میرے کمرے میں آؤ گے تو میرے والدین کیا سوچیں گے۔اول تو وہ تمہیں میرے کمرے میں آنے ہی نہیں دیں گے۔''مہوش نے حیرت سے کہا۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو دیکھنا میں کیسے آتا ہوں۔''راجو نے جلدی سے جواب دیا۔

''نہیں کوئی مسئلہ بن جائے گا۔''مہوش نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا پلیز۔''راجو نے بضد لہجے میں کہا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو۔''مہوش بولی۔

''میں آرہا ہوں۔تمہارے گھر کی بیرونی سائیڈ سے آؤں گا۔کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا۔''راجو نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا اور مہوش کی بات سنے بغیر کال منقطع کر دی۔

مہوش کا راجو کی بات سن کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔عین اسی وقت اس کی ماں چائے لیے اس کے کمرے میں آگئی۔

''کیا بات ہے بیٹا آج کمرے میں ہی مقید ہو کر رہ گئی ہو؟''اس کی ماں نے چائے کا کپ بیڈ کے ساتھ رکھے چھوٹے سے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس ٹیبل پر پہلے سے ہی جگ گلاس پڑا ہوا تھا۔گلاس کو اس کی والدہ نے تھوڑا اور آگے سرکا کر جگ کے پاس رکھ دیا تھا۔

''کچھ نہیں امی۔بس ایسے ہی۔''اس نے بالوں کو اچھی طرح کلپ کی زد میں جکڑتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا یہ چائے لے آئی تھی تمہارے لیے۔''اس کی ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے امی۔''مہوش نے جواب دیا۔''چائے پی کر میں سو جاؤں گی نیند بہت آئی ہے۔''

''خیریت تو ہے نہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہی ہے نہ بیٹا ؟''اس کی ماں نے اس کی نبض چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''امی میں بالکل ٹھیک ہوں۔آپ پریشان نہ ہوں۔ایسی کوئی بات نہیں۔بس آج تھکاوٹ سی ہوگئی ہے اور نیند بہت آرہی ہے۔''مہوش نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں میری بچی تم آرام کرو۔''اس کی ماں اس کی گال تھتھپاتے ہوئے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

عین اسی وقت راجو کمرے میں داخل ہوا۔مہوش نے اسے سنگھار شیشے میں ہی دیکھ لیا تھا۔اس کا دل دھک سے حلق کو آن لگا تھا۔وہ رب کا شکر ادا کررہی تھی کہ شکر ہے اس کی ماں کو پتہ نہیں چلا۔راجو اندر کیا آیا مہوش نے جلدی سے دروازہ کو اندر سے مقفل کردیا۔

''تم بہت بڑے مورکھ ہو۔اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو جانتے ہو قیامت برپا ہو جائے گی۔''مہوش نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔میں بس تمہارے لیے شادی کا ایک تحفہ تیار کرنا چاہتا ہوں۔''راجو نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''مہوش نے انگشت بدنداں ہو کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں تمہاری ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ایک یادگار تصویر جو شادی کے بعد میں تمہیں گفٹ کروں گا۔''راجو نے ساتھ لائے سامان کو سنگھار پر جوڑتے ہوئے کہا۔

سامان کیا تھا۔کچھ کلرز اور برش،ساتھ میں ایک چارٹ جو لکڑی کے ایک تختے پر فٹ کیا ہوا تھا۔

''شادی کے بعد بھی تو تصویر بنائی جاسکتی تھی؟''مہوش نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تصویر ایک اسپیشل تصویر ہوگی۔جو میں تمہیں شادی کی یادگار کے طور پر گفٹ کروں گا۔''راجو نے ایک ڈبیہ کے ڈھکن میں کلر اور مٹی کا تیل مکس کرتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو اس بیڈ پر ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاؤ۔''

راجو کا لہجہ تحکمانہ تھا۔لیکن اس کے انداز میں سختی نہ تھی۔

''چائے پیو گے کیا؟''مہوش نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یہ کپ بھی اٹھالو۔ایک نیا رنگ اور نیا نکھار پیدا ہو جائے گا۔''راجو نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

مہوش اس کی بات سن کر زیرلب مسکرادی اور کپ اٹھا کر چسکیاں بھرنے لگی۔راجو نے قلم تھام لیا اور کبھی مہوش کو دیکھتا اور کبھی قلم چلاتا۔اس نے تصویر کیسی بنائی تھی اچھی یا بہت اچھی۔لیکن اس نے تصویر مہوش کو اس کے بے حد اصرار پر بھی نہ دکھائی۔مہوش کا تصویر دیکھنے کو بہت من کر رہا تھا لیکن راجو سب کچھ سنبھالتا جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے پچھلے پہر کا وقت تھا۔مہوش اس وقت گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی ۔ یکبارگی اس کے کمرے کی لائٹ آن ہوگئی۔لائٹ کیا آن ہوئی اس کی یک لخت آنکھ کھل گئی ۔

کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ یہی نہیں کمرے کی چٹخنی بھی اسی طرح لگی ہوئی تھی جیسے وہ لگا کر سوئی تھی ۔اس کی حیرت ہویدا ہوئی ۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ سوتے وقت اس نے خود لائٹ آف کی تھی ۔

''شاید میں نے لائٹ آف نہ کی ہو۔''مہوش سر جھٹکتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی ۔

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کرنا چاہی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی ۔لائٹ کا بٹن اوپر تھا۔جس کا مطلب تھا کہ اس نے واقعی لائٹ آف کی تھی ۔اس نے ایک دو بار بٹن کو اوپر نیچے کیا لیکن بے سود۔پھر اس نے باقی بٹن اوپر نیچے کیے سارے بٹن کام کر رہے تھے ۔

اس نے سوچا کہ شاید یہ بٹن لوز ہو گیا ہے ۔ اسے شدید غصہ آیا کہ وہ لائٹ آف کر کے سونے کی عادی تھی ۔اب ساری رات کروٹیں بدلنے میں بیت جائے گی ۔نیند سارا دن اسے ستائے گی لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔

مہوش ابھی ٹھیک سے لیٹی بھی نہ تھی کہ لائٹ ٹمٹمانے لگی ۔اس کا دل دھک سے حلق کو آن لگا ۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی ۔اس کا حلق تھا کہ خشک ہوئے جا رہا تھا۔ یکبارگی لائٹ ٹمٹمانا ٹھیک ہوگئی ۔مہوش نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔

وہ جیسے ہی دوبارہ لیٹنے لگی اس کی نگاہ سامنے صوفے پر پڑی ۔اگلا منظر دیکھ کر تو اس کے حواس باختہ ہو گئے تھے۔اس کی نگاہوں کے سامنے اسی کی عمر کی ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ براجمان تھی ۔وہ دوشیزہ اسے ٹکٹکی باندھے تکے جا رہی تھی ۔

مہوش کبھی اسے دیکھتی تو کبھی دروازے کی لگی چٹخنی کو۔مہوش کو اپنا قلب حلق سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا لہو منجمد ہو کر رہ گیا ہے ۔اس کی سانسوں کی روانی بے ترتیب ہونے لگی تھی۔اس نے بولنا چاہا لیکن یوں لگا جیسے زمین تالو کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہو۔خوف سے اس کے پورے شریر میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی تھی۔

''تمہیں زیادہ سوچنے اور مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔''اچانک صوفے پر براجمان دوشیزہ گویا ہوئی ۔

اس دوشیزہ کی آواز یوں لگ رہا تھا جیسے دور کسی گہرے کنویں کی گہرائی سے آ رہی ہو۔ایک عجیب کا رعب و دبدبہ اس کے لہجے میں تھا۔ یہی نہیں اس کی سرخ خون اگلتی آنکھیں مہوش پر اپنا تسلط جمانے کی سعی کر رہی تھیں ۔

''میرے لیے تمہارے یہ درو دیوار کوئی فوقیت نہیں رکھتے کیونکہ میں تمہاری طرح منش نہیں بلکہ ایک جن زادی ہوں ۔''

اس کی بات سن کر تو جیسے مہوش کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے ۔ ہاتھ پاؤں جیسے پھول گئے تھے ۔جن زادی کا لفظ اس نے

کچھ اس ادا سے ادا کیا تھا کہ مہوش اس لفظ کو سنتے ساتھ ہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگی تھی۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں بھاگ کر اس کمرے سے نکل جائے۔لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں کسی نے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیئے ہوں۔اس نے مدد کے لیے اپنے والدین کو بلانا چاہا لیکن اس کی زبان تو اس کا ساتھ دینے کے لیے قطعی آمادہ نہ تھی۔

اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بے حد ملال ہو رہا تھا۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ بلک بلک کر رو دے لیکن رونے سے مصیبتیں دفع دور نہیں ہوا کرتی۔

''مجھے آج مجبوراً تمہارے پاس آنا پڑا کیونکہ تم مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھیننے والی ہو۔تم جانتی ہو کہ میں بھی راجو کے گھر کے صحن میں لگے قد آدم ٹاہلی کے درخت پر رہتی ہوں۔راجو کو میں بچپن سے بہت چاہتی ہوں لیکن اب جب سے تم اس کی زندگی میں آئی ہو اس کی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئی ہیں۔

وہ کسی اور کو چاہے یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔میں اس کی زندگی میں آنے والی ہر لڑکی کا قلع قمع کر کے رکھ دوں گی کیونکہ میں سب سے زیادہ راجو کو چاہتی ہوں۔آج میں چاہوں تو تمہیں یہیں ابھی اور اسی وقت جلا کر بھسم کر دوں لیکن میں ایسا قطعاً نہیں کروں گی۔اس طرح اگر کل کو راجو کو خبر ہوگئی تو وہ مجھ سے نہ صرف بہت نفرت کرے گا بلکہ مجھے اس کی نفرت سہنا بھی پڑے گی۔

میں تمہیں اسی تصویر میں قید کر کے رکھ دوں گی جو تصویر راجو نے تمہیں شادی کے دن گفٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔پھر میں تمہارا روپ دھار کر اس گھر کا فرد بن جاؤں گی۔یہاں کے باسیوں کی نظروں میں میں مہوش ہی ہوؤں گی لیکن حقیقت میں تم اس تصویر میں قید ہو کر رہ جاؤ گی۔پھر مہندی کی رات میں زہر کھا کر مرنے کا ڈرامہ رچاؤں گی اور عین اس وقت جب ہر کس و ناکس مجھے دفن کر کے واپس آئے گا۔میں اپنے جادو کے زور پر اس قبر سے باہر نکل آؤں گی۔

پھر آہستہ آہستہ راجو کے دل میں اپنی محبت کا رس انڈیلنا شروع کر دوں گی۔ایک دن راجو میرا عادی ہو جائے گا۔پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راجو کو اپنا لوں گی اور اسے اپنی دنیا میں لے جاؤں گی۔جہاں سے دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے واپس نہیں لا سکے گی۔

تم یہ مت سمجھنا کہ تم اس تصویر میں قید ہو کر کچھ دیکھ یا سن نہیں پاؤ گی۔بلکہ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گی بھی اور سنو گی بھی۔لیکن تمہاری زبان کو ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا جائے گا۔تمہاری حرکات وسکنات کو ختم کر دیا جائے گا۔

ہاں البتہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ایک نوجوان لڑکا جو راجو کا ہی ہمشکل ہوگا۔اگر تم اس کے سامنے بولو گی تو وہ تمہاری آواز سن سکے گا۔وہ تم سے محبت کرے گا۔اگر اس لڑکے نے مجھے شکست دے دی تو تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گی لیکن اگر وہ ہار گیا تو پھر دنیا کی کوئی بھی شکتی تمہیں کبھی بھی اس تصویر سے بریت نہیں دلا پائے گی۔

یہی نہیں یاد رکھنا اس خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ وہ لڑکا مجھے شکست فاش کر سکے گا۔نہیں میں بہت شکتی شالی

ہوں۔ راجو میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ اور یہ بات بھی ہمہ تن گوش ہو کر سن لو کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ شکتی شالی کوئی نہیں ہے۔''

صوفے پر براجمان دوشیزہ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا تھا۔ اس کی ہر ہر بات مہوش کے اندر خوف کے تاثرات بھر رہی تھی۔ اس دوشیزہ نے اپنی بات ختم کر کے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے مہوش کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مہوش کا جسم بائیں جانب لڑھک گیا دوسرے ہی لمحے مہوش کے بدن نے دھوئیں کا روپ دھارنے لگا اور پھر دھوئیں کی ایک باریک سی لہر کمرے کی کھڑکی کے ادھ کھلے کواڑ میں سے باہر نکلتی دکھائی دینے لگی۔

☆......☆......☆

اپنی دکھ بھری روداد سنانے کے بعد جیسے تصویر والی لڑکی ایک بار پھر ساکت و صامت ہو کر رہ گئی تھی۔ شاہان ٹکٹکی باندھے جہاں اسے دیکھ رہا تھا وہیں ہمہ تن گوش اس کی آپ بیتی بھی سنے جا رہا تھا۔ شاید ہی کبھی کسی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہو کہ اس نے ہاتھ سے بنائی گئی پینٹنگ میں دکھائی پڑنے والی لڑکی یا کسی ذی روح کو بولتے دیکھا ہو۔

شاہان کے لیے اس تصویر والی لڑکی کی کہانی کا ایک ایک لفظ حیرت کے سمندر میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ شاہان حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سوچے جا رہا تھا۔ کہ اب تک اس نے جو کچھ سنا کیا یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دیکھا اور سنا گیا ہے یا پھر اس کی نظر کا دھوکہ اور وہم ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو شاہان۔''

ایک بار پھر وہی پرتاثیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو شاہان نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے اس تصویر کی طرف دیکھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کہیں آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں ہے۔'' شاہان نے سوالیہ آنکھوں سے تصویر والی لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں شاہان میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے اس میں کوئی دروغ گوئی کا عنصر موجود نہیں ہے۔'' تصویر والی دوشیزہ نے اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تم اس تصویر سے بریت حاصل نہیں کر سکتی؟'' شاہان نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تو ہے کہ اس دوشیزہ نے بتایا تھا کہ وہ انسان جو تمہاری آواز سننے کی شکتی رکھتا ہو گا وہ اگر چاہے تو تمہیں اس تصویر کی قید سے بریت دلا پائے گا۔'' تصویر والی لڑکی گویا ہوئی۔

''لیکن کیسے؟'' شاہان نے پوچھا۔

''تمہیں کسی طرح راجو کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو گا کہ میں زندہ ہوں اور اس جن زادی نے مجھے اس تصویر میں

مقید کر دیا ہے۔ پھر اگر راجو تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہے تو تم لوگوں کو کسی نیک انسان کی خدمات لینا ہوں گی۔ اسے ساری بات بتانا ہوگی تب جا کر وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اس طرح وہ مجھے اپنے علم کی بدولت ہی اس تصویر کی قید سے بریت دلا پائے گا۔ بصورت دیگر اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھنا راجو سے اس کے گھر میں جا کر ملاقات مت کرنا وگرنہ اس جن زادی کو اس بات کا پتہ چل جائے گا اور وہ اس کا ذہن اپنی قید میں کر لے گی۔''

تصویر والی لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے شاہان کو ساری بات بتائی۔ جبکہ شاہان کو اس کی بات سن کر جہاں حیرت ہوئی وہیں پریشانی بھی کہ راجو جو اس وقت ایک مایہ ناز شخصیت بن چکا تھا۔ جس کی مصوری کے چرچے اندرون و بیرون گونج رہے تھے بھلا ایسے انسان سے اتنی آسانی سے ملاقات کیسے ہوسکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف اس تصویر والی لڑکی نے شاید اس کا دماغ پڑھ لیا تھا۔

''میں تمہیں اس کا نمبر دیتی ہوں۔ تم ایسا کرو اس سے رابطہ کرو۔ راجو اتنا برا انسان نہیں ہے۔ وہ ایک بار تمہاری بات غور سے سنے گا۔ یہ تم پر depend کرتا ہے کہ تم کیسے اسے اس بات پر راضی کر سکتے ہو کہ میں اس تصویر میں قید ہوں۔''

شاہان اس کی بات سن کر متواتر مضطرب تھا۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ راجو کو اس بات پر راضی کر لے گا۔

☆......☆......☆

شاہان کو یقین نہیں تھا کہ راجو اس کی بات پر اتنی جلدی یقین کر لے گا لیکن شاہان کی بات سن کر راجو نے کہا کہ:

''مجھے اسی دن ہی یقین ہو گیا تھا کہ مہوش کے ساتھ کوئی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس جن زادی نے مہوش کا روپ دھار کر مجھے اپنا گرویدہ کرنا چاہا تھا لیکن مہوش اور اس کے گفت و شنید کرنے میں زمین و آسمان کا تضاد تھا۔''

دونوں اس بات پر متفق تھے کہ وہ آج ہی کسی سے رابطہ کریں گے۔ دوسری طرف راجو جو اس بات سے بہت پریشان تھا کہ اس کی بنائی گئی تصویر اچانک ہی اس کے کمرے سے غائب ہو گئی تھی۔

شاہان کے منہ سے اس تصویر کا سن کر اس نے شاہان سے کہا کہ ''مجھے ایک بار اس تصویر کو دکھا دو اس تصویر میں میری محبت مقید ہے۔ کتنا عرصہ بیت گیا ہے، اپنی محبت کو دیکھے۔''

بات مکمل کرنے تک راجو کی آنکھیں ساون بھادوں ہو چکی تھیں۔ جن آنکھوں میں کبھی مستقبل کے سپنے ہوتے تھے آج انہی آنکھوں میں اشک بھرے تھے۔

☆......☆......☆

راجو نے گھر والوں کو ساری بات بتا دی تھی۔ یہی نہیں دوسری طرف مہوش کے گھر والوں کو بھی ساری بات بتا دی گئی

تھی ۔راجواور شاہان نے ایک بزرگ کی خدمات حاصل کر لی تھیں ۔

اس بزرگ نے راجو کو ایک تعویذ دیا تھا کہ اسے گلے میں پہنے رکھنا تا کہ وہ جن زادی تم پر مسلط نہ ہو پائے ۔پھر اس بزرگ نے ایک اگربتی دی اور کہا کہ گھر کے سارے ممبران کو ایک کمرے میں بٹھا کر اس اگربتی کو جلا دینا۔

جب تک اس کی بساند کمرے میں رہے گی وہ جن زادی اس کمرے تک پہنچنے کی جسارت بھی نہ کر پائے گی ۔

بزرگ نے عشاء کی نماز کے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔شاہان بھی راجو کے ساتھ ہی اس کمرے میں براجمان تھا۔جس میں اگربتی لگائی گئی تھی ۔ ہر کس وناکس شاہان کا مشکور تھا۔

شاہان اس وقت خود کو بہت بڑا انسان سمجھ رہا تھا۔اسے جتنی پذیرائی ملی تھی اس کا اس نے تخیل میں بھی نہ سوچا تھا۔اس کے کمرے میں لگی مہوش کی تصویر بھی اب یہاں لائی گئی تھی ۔

سب چپ سادھے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے جس میں مہوش مقید تھی ۔بس ایک شاہان تھا جو آنکھوں کے اشاروں سے مہوش سے بات کر رہا تھا۔اس کی ہر بات سب سے پوشیدہ تھی ۔ وہ آنکھوں کے اشاروں سے مہوش کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ جلد ہی اس تصویر کی قید سے بریت حاصل کرنے والی ہے ۔

تبھی ڈوربیل کی چیخ نے سب کو چونکا دیا۔ راجو سرعت سے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی باریش اور پر رعب بزرگ تھے ۔جن کے چہرے پر جلال رقصاں تھا۔سرخ وسپید چہرے نور کی تجلیات مترشح تھیں ۔ ان کی تعزیم میں سب ایستادہ ہو گئے تھے ۔

بزرگ کو ایک صوفے پر بٹھایا گیا ۔ بیٹھتے ساتھ ہی انہوں نے تکلفات سے منع کر دیا۔انہیں آگے کہیں جانا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت جلدی میں تھے ۔

پھر اس بزرگ نے سب سے کہا کہ وہ باہر صحن میں آجائیں اور اس تصویر کو بھی صحن میں لے آئیں ۔ سب سے پہلے بزرگ اس کمرے سے باہر نکلے اور نکلتے ہوئے انہوں نے راجو سے کہا کہ ایک چھری لے کر آؤ۔

راجو کچن میں گھس گیا جبکہ شاہان جو سب سے آخر میں کمرے سے باہر نکلا تھا اس نے تصویر اٹھائی ہوئی تھی ۔

راجو چھری لے کر آیا تو بزرگ نے سب کو ایک جگہ اکٹھا بٹھا کر ان کے گرد چھری سے دائرہ کھینچا ساتھ ہی ساتھ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے جا رہے تھے ۔

تصویر انہوں نے شاہان سے لے لی تھی ۔اسے ایک الگ جگہ رکھ کر اس کے گرد بھی دائرہ لگا دیا گیا تھا۔پھر بزرگ خود بھی ایک دائرے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے ۔

بزرگ نے سب کو سختی سے منع کیا کہ کیسے ہی حالات کیوں نہ جنم لے لیں کوئی بھی اپنے دائرے سے باہر نکلنے کی تقصیر نہ کرے

وگرنہ پیش آنے والے واقعات کا ذمہ دار وہ خود ہی ہو گا۔

اس کے بعد اس نیک سیرت وصورت بزرگ نے اونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا شروع کر دی۔

اچانک سب کو یوں لگا جیسے کوئی کچن میں ہو اور برتن اٹھا اٹھا کر پھینک رہا ہو۔ برتن پھینکنے کی بازگشت سب کو متر شح سنائی دے رہی تھی۔ ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

سب کی نگاہیں کچن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یکبارگی سب نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ کچن کے دروازے میں انہیں کوئی شبیہہ دکھائی دی۔ پھر اس شبیہہ نے انسانی روپ اختیا کیا۔ یک لخت ان کے سامنے ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ ایستادہ تھی۔

اس دوشیزہ کی کھا جانے والی نگاہیں سب پر مرکوز تھیں۔ تبھی اس کی سرعت سے گھومتی آنکھوں کی پتلیاں آ کر راجو پر رک گئیں۔ وہ راجو کو متواتر گھورے جا رہی تھی۔ راجو کو اس خبیث لڑکی پر تاؤ چڑھ رہا تھا۔ اگر بزرگ نے انہیں سختی سے منع نہ کیا ہوتا تو وہ اٹھ کر جا کر اس کی کرچیاں کرچیاں کر کے رکھ دیتا۔

تبھی اس لڑکی نے سر جھٹکا اور آ کر بزرگ کے سامنے دوزانوں براجمان ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا اور اس بزرگ کا کوئی بہت ہی قریبی سمبندھ ہو۔ لڑکی کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ اس بزرگ نے تلاوت ختم کی۔

''اے ظالم! تو نے ایسا گناہ کیوں کیا۔ کیوں ایک مظلوم لڑکی کو ایک تصویر میں مقید کر کے رکھ دیا۔ تم کون ہوتی ہو ایسی جسارت کرنے والی؟'' بزرگ نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں راجو سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ میرے علاوہ کوئی اور اس کی زندگی میں آئے۔'' اس لڑکی نے نم آلود لہجے میں جواب دیا۔

''پہلے اس مظلوم کو اس تصویر کی قید سے بریت دلاؤ جلدی۔'' بزرگ نے اب کی بار تحکمانہ لہجے میں تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

بزرگ کی بات سن کر اس دوشیزہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس تصویر کی طرف کی تو دوسرے ہی لمحے تصویر میں سے دودھیا دھواں باریک لہر کی صورت میں نکلنا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے انسانی روپ دھارنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے سب کے سامنے دائرے کے اندر مہوش براجمان تھی۔ جو تصویر کی قید سے بریت حاصل ہونے پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے جسم کو ٹٹول رہی تھی۔ کبھی وہ تصویر کو دیکھتی اور کبھی خود کو۔ پھر اس نے ایک نگاہ سب پر ڈالی تو اس کی آنکھیں خوشی سے نم آلود ہو گئیں۔

''دائرے سے باہر مت نکلنا بچی۔'' بزرگ نے مہوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جواباً مہوش نے ان کی بات کی تائید میں سر ہلا دیا۔

''کسی کو چاہنے یا حاصل کرنے کا یہ طریقہ تم بھی جانتی ہو کہ غلط ہے۔'' اب کی بار بزرگ نے چنداں نرم لہجے میں کہا۔

''محبت میں غلط صحیح کی پہچان ہی کہاں رہتی ہے۔اندھا کر دیتی ہے یہ محبت۔آنکھوں میں بینائی ہونے کے باوجود دکھائی کچھ نہیں پڑتا۔اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو اپنا آپ۔''اس لڑکی نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم بھی تو ایک مسلمان جن زادی ہو۔اگر میں تمہیں ہمیشہ کے اسی تصویر(انگلی سے تصویر میں مقید کر دوں تو تم پر کیا بیتے گی؟''بزرگ نے سوالیہ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے ابدی نیند سلا دیں۔''جن زادی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

اس کی حالت پر سب کو ہی ترس آ رہا تھا۔بے شک اس نے بہت بڑا گناہ کیا تھا لیکن اس وقت اس پر سب کو ترس آ رہا تھا۔خود مہوش جو اس کے لیے دل میں کتنی ہی نفرت لیے ہوئی تھی۔اسے بھی اس کی حالت پر بہت ترس آ رہا تھا۔

''تم ایک اچھی جن زادی ہو۔اس بات سے آشنا ہو کہ اگر تم کسی انسان سے محبت کر کے اسے اپناؤ گی تو تمہاری ساری شکتیاں مفقود پڑ جائیں گی۔''بزرگ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''شکتیاں محبت کے سامنے کوئی فوقیت نہیں رکھتیں ...... دنیا میں سب سے بڑی شکتی تو ہے ہی محبت۔''اس جن زادی نے متواتر گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

''تو کیا تم واقعی محبت کی خاطر اپنی شکتیوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو؟''اب کی بار بزرگ نے چنداں کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

لڑکی نے بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔بس ایک بار اس نے بے بسی اور بے چارگی سے بزرگ کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور دائرے سے باہر نکل آئے۔انہوں نے اس جن زادی کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ جن زادی ان کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگی۔

''مجھے میری محبت سے دور مت کیجئے گا ...... خدا کے لیے ...... میں دوبارہ کبھی بھی ان کے سامنے نہیں آؤں گی ...... لیکن راجو کی جدائی سہنا میرے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مرنے کے مطابق ہے۔''جن زادی نے اب کی بار دھواں دھار روتے ہوئے کہا۔

''اٹھو بیٹی۔''بزرگ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

جن زادی بزرگ کی بات سن کر اپنی جگہ پر ایستادہ ہوگئی۔

''کوئی بھی کام کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ بنا کسی طریقے کے کوئی بھی کام بہتر نہیں لگتا۔''

بات مکمل کرنے کے بعد بزرگ دائرے میں براجمان سب کی طرف متوجہ ہوئے۔

''آپ لوگ کمرے میں آیئے۔''

حکم دیتے ہوئے بزرگ اس لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے اسی کمرے میں چلے گئے جہاں اگر بتی لگائی گئی تھی۔

سب یکے بعد دیگرے بزرگ کے پیچھے اس کمرے میں آ گئے۔اب کی بار تصویر کسی نے نہیں اٹھائی تھی۔وہ ایسے ہی اپنی جگہ دھری کی دھری تھی۔ شاہان تصویر اٹھانے لگا تھا لیکن مہوش نے منع کر دیا تھا کہ مجھے اس تصویر سے ڈر لگتا ہے۔اسے دوبارہ کمرے میں نہ لانا۔اس لیے شاہان نے تصویر کو ادھر ہی رکھ دیا تھا۔

سب اس کمرے میں بزرگ کے سامنے مجتمع تھے۔سب کی سوالیہ نگاہیں بزرگ پر گڑھی ہوئی تھیں جبکہ شاہان بار بار کن آنکھوں سے مہوش کو دیکھ رہا تھا۔دوسری طرف مہوش کی نگاہیں بھی بار بار شاہان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔نجانے کیوں اور کیسے اسے شاہان میں دلچسپی ہو گئی تھی۔

ویسے بھی شاہان اس کا محسن تھا۔اس کی وجہ سے اسے ایک نئی زندگی ملی تھی۔وگرنہ وہ تو تازیست اس تصویر میں مقید ہو کر رہ جاتی اور ایک دن یہ تصویر اس کی جان لے لیتی۔

''میں آپ لوگوں سے کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''اچانک کمرے کی سکوت زدہ فضا میں بزرگ کی آواز گونجی۔تو راجو اور مہوش کے والدین سمیت باقی سب نے بھی سوالیہ نگاہوں سے بزرگ کو دیکھا۔

''جو کچھ بھی ہوا۔آپ لوگوں نے اپنی سماعت سے سنا بھی اور اپنی بینائی سے دیکھا بھی۔کچھ بھی آپ لوگوں سے پنہاں نہیں ہے۔''

بزرگ نے اپنا فقرہ مکمل کر کے سب کی طرف دیکھا تو سب نے ان کی بات سے متفق ہوتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا۔جن زادی بزرگ کے پیروں سے چمٹی ہوئی تھی۔جیسے ابھی تک اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں اسے راجو سے دور نہ کر دیا جائے۔اس کا شریر خوف سے بری طرح رائبریٹ کر رہا تھا۔بزرگ نے اچانک اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا اور اس نے ترحم آمیز نگاہوں سے بزرگ کو دیکھا۔

''بے شک اس لڑکی کا طریقہ غلط تھا۔لیکن پیار اور جنگ میں سیانے کہتے ہیں کہ سب کچھ جائز ہوتا ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے ظلم نہیں کیا اسے قطعاً ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔لیکن اب اس کے اندر بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔یہ اپنی غلطی کو تسلیم کر چکی ہے۔اب آپ لوگ کیا کہتے ہو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟''

اب کی بار فقرہ مکمل کرنے کے بعد بزرگ نے صرف مہوش کے گھر والوں کو بغور دیکھا تھا۔بزرگ کی بات سن کر وہ جن زادی مزید زور سے بزرگ کے پیروں سے چمٹ گئی تھی۔اس کی سسکیوں نے خاموش فضا میں گونجنا شروع کر دیا۔

''اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو ہم لوگ اسے معاف کرتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ یہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔''بزرگ کی بات سن کر مہوش کے والد نے جواب دیا۔

''اگر آپ لوگ واقعی اسے معاف کرتے ہیں تو کیا میرے فیصلے سے آپ لوگ متفق ہوں گے؟'' بزرگ نے اپنا دست شفقت ایک بار پھر اس جن زادی کے سر پر پھیرتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اس لڑکی کو اپنی دختر بنانا چاہتا ہوں۔''

بزرگ کی بات سن کر سب نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔

''اور اس کے لیے آپ کے پسر راجو کا ہاتھ مانگتا ہوں۔''

تھوڑا توقف کرنے کے بعد اچانک بزرگ بولے تو ان کی بات سن کر ہر کس و ناکس اپنی جگہ ساکت وصامت رہ گیا۔ یہی نہیں سسکتی جن زادی بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بزرگ کو تکنے لگی تھی۔

''بے شک مہوش اور راجو ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے لیکن اب حالات کروٹ بدل چکے ہیں۔ مہوش کے دل میں بے شک راجو کے لیے پیار ہے لیکن جتنا پیار اس کے دل میں شاہان کے لیے ہے اتنا راجو کے لیے نہیں ہے۔''

''باباجی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' شاہان کا والد تقریباً بھڑک کر بولا۔

''ہمارا پسر مہوش سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے اور یہ جن زادی بے شک ہم نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن ایک جن زادی اور انسان کا کبھی کوئی سمبندھ نہیں بن سکتا۔''

راجو کے باپ کی بات سن کر سب نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔

''آپ کو بنا سوچے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔'' اب کی بار مہوش کی والدہ نے لقمہ دیا۔ ''آپ نے ہماری دختر کو ایک نئی زندگی دی۔ ایک مصیبت سے اسے چھٹکارا دلایا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کے بدلے میں ہم اپنی دختر کی خوشیاں ایک بار پھر قربان کر دیں۔ ہماری دختر راجو کو ہی چاہتی ہے اور اس کی شادی راجو سے ہی ہو گی۔ رہی بات شاہان کی تو ہم تازیست اس کے مشکور رہیں گے۔''

''نہیں امی۔'' والدہ کی بات سن کر مہوش فوراً بولی۔ ''باباجی درست فرما رہے ہیں۔ ایک لمبا عرصہ راجو سے دور رہنے اور شاہان کے ساتھ رہنے سے مجھے شاہان سے بہت پیار ہو گیا ہے۔''

مہوش کی بات سن کر ہر کس و ناکس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ راجو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی محبت اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی ایسی بے عزتی کرے گی۔

''راجو تم بہت اچھے ہو لیکن مائنڈ نہ کرنا میں اب تم میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ ہمارے گھر والے اگر ہماری زبردستی شادی کر دیں گے تو میں اف تک نہیں کروں گی لیکن یاد رکھنا میرے دل میں ہمیشہ کے لیے شاہان بس چکا ہے۔''

مہوش نے پاس براجمان راجو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس کی بات سن کر راجو کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔ دوسری

طرف شاہان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ متوحش نگاہوں سے کبھی کسی کو دیکھتا تو کبھی کسی کو۔

''مہوش بیٹا۔'' مہوش نے والد نے اسے مخاطب کیا۔ ''تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

مہوش نے باپ کی بات سن کر سر ہلایا گویا وہ اپنے باپ کی بات کی تصدیق کر رہی ہو۔

''جی ابو میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اتنے عرصے میں میں نے شاہان کو جتنا سمجھا ہے۔ راجو کو کبھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ ویسے بھی راجو سے مجھ سے زیادہ میری یہ بہن (جن زادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پیار کرتی ہے۔''

''جلد بازی کے فیصلے بعد میں پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔'' راجو کی والدہ نے پہلی بار اپنے پسر کی اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے مہوش کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں جلد بازی نہیں کر رہی آنٹی۔ میں نے اتنے عرصے میں بہت کچھ سوچ سمجھ لیا تھا۔'' مہوش نے جواب دیا۔

''آپ لوگوں کو آپس میں بحث کی بجائے میری بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ بچوں کو اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس حق کو چھیننے کا آپ کا کوئی حق نہیں بنتا۔ راجو کے لیے میری اس دختر سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اور مہوش بیٹی کے لیے شاہان سے زیادہ پیار کرنے والا کوئی نہیں ہے۔'' بزرگ نے انہیں آپس میں بحث و تکرار کرتے دیکھ کر کہا تو چاروناچار انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔

شاہان خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ دوسری طرف جن زادی بزرگ سے چمٹی نجانے کتنی دیر تک زاروقطار روتی رہی تھی۔ اس نے سب کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی شکتیوں کو قربان کر کے راجو سے شادی کر لے گی۔ اس نے نہ صرف مہوش سے بلکہ وہاں موجود ہر کس و ناکس سے معافی مانگ لی تھی۔ یہی نہیں شاہان کو اس نے مبارکباد دی تھی۔

راجو نے بھی بزرگ کے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس نے مہوش اور شاہان کو مبارکباد دی تھی۔ مہوش نے راجو سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کو یاد نہیں کرے گا بلکہ اب کی زندگی میں جو آنے والی ہے وہ اس سے بھی زیادہ راجو سے محبت کرتی ہے۔ راجو نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ گزرتی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس جن زادی سے شادی کر لے گا۔

کہتے ہیں کہ جن زادی نے محبت کی خاطر نہ صرف اپنے اہل و عیال اور قبیلے کو خیرآباد کہہ دیا تھا بلکہ اپنی شکتیوں کو بھی قربان کر دیا تھا۔ یکے بعد دیگرے راجو کو اس جن زادی سے جس کا نام شمائل رکھ دیا گیا تھا تین پسر زاور ایک دختر ہوئی تھی۔

دوسری طرف شاہان اور مہوش کی ایک دختر اور ایک ہی پسر تھا۔ وقت تیزی سے پر لگا کے گزرتا چلا گیا اور آج ان کی اولاد جوانی کی دہلیز کو چھو چکی ہے۔ مہوش کے والد خالق حقیقی کو جا ملے تھے۔ والدہ حیات تھی۔

جن زادی کو دختر بنانے والے اور مہوش کو تصویر کی قید سے بریت دلانے والے بزرگ ان کی شادی کے بعد نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی دختر (شمائل) جب بھی انہیں یاد کرتی ہے وہ حاضر ہو جاتے ہیں۔ ان بزرگ کے کیے گئے فیصلے کو سب

نے تسلیم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

☆......☆......☆

کچھ نام نہادلوگ شاہین ڈائجسٹ کی شہرت سے جیلس ہوکرشاہین ڈائجسٹ کے بارے میں مختلف قسم کی افواہیں پھیلارہے ہیں۔شاہین ڈائجسٹ یا شاہین ڈائجسٹ کی ٹیم سے متعلق کسی بھی قسم کی شکایت کے بارے میں ہمیں ضرورآگاہ کریں۔یہ بات روزروشن کی طرح عیاں ہے کہ شاہین ڈائجسٹ کی شہرت کچھ لوگوں کے پیٹ میں کانٹے کی طرح چبھ چکی ہے لیکن ہم کسی پر انگلی نہیں اٹھانا چاہتے بلکہ سب سے درخواست کرتے ہیں کہ جس کسی کو بھی جو بھی مسئلہ ہے۔ضرور آگاہ کرے۔ہرممکن اس مسئلے کے حل کے لے تگ ودو کی جائے گی۔

آپ کا اپنا

محمد ندیم عباس میواتی

ایڈیٹر شاہین ڈائجسٹ


خونی خزانہ

خونی خزانہ

تحریر: ملک این اے کاوش......سلانوالی، سرگودھا

بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لادا۔ اس کے پائوں لڑکھڑا رہے تھے۔عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔خوابوں کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

تینوں دوست نقشہ سامنے میز پر رکھے سر جوڑے مضطرب براجمان تھے۔علی اور حیدر بضد تھے کہ نقشہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جبکہ عثمان متواتر انہیں سمجھا رہا تھا کہ نقشے تک پہنچنے سے قبل ہی اجل اچک لے جائے گی لیکن دونوں دوستوں کی ضد اپنی جگہ برقرار تھی۔

''میں نے خود پتہ لگوایا ہے۔ یہ خزانہ جس غار کے اندر ہے اس سے پہلے ایک گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے۔''عثمان نے انہیں بتایا۔''اس جنگل کی طرف جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا۔''

''لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔''حیدر بولا۔''ہم ثابت کردیں گے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں۔ اس دنیا میں سب سے طاقتور انسان ہے۔ چاہے جو ہر چیز کو اپنا بندی بنالے۔''

''وہ لوگ اور ہیں۔''عثمان بے چارگی سے بولا۔''ہم لوگ اپنی قسمت نہیں بدل پا رہے ہر چیز کو اپنا بندی کیسے بنائیں گے؟''

''قسمت بدلنے کا وقت اب آچکا ہے میرے بھائی۔''علی نے لقمہ دیا۔''اگر اس موقع سے ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ممکن ہے کوئی اور ہی مستفید ہو جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔''

عثمان نے مجبوراً حامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔اس کے من کے مندر میں خوف کی گھنٹیاں پیہم بج رہی تھیں لیکن دوستوں کے سامنے انکار کر کے وہ خود کو بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔اس لیے اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا۔

☆......☆......☆

تین گھنٹے مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک چکے تھے۔گاڑی سے اترتے ساتھ ہی انہوں نے پہلے ایک ہوٹل سے جا کر ڈٹ کر کھانا کھایا۔کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ویٹر سے چوک محل کا راستہ پوچھا تو اس نے حیرت سے انہیں گھورا۔

''وہاں کیا کرنے جا رہے ہو تم لوگ؟''ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا راستہ بتا سکتے ہو؟''حیدر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔''ویٹر بولا۔''لیکن مشورہ دوں گا یہیں سے واپس چلتے بنو۔جو بھی اس طرف گیا کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔''

''کیا راستہ بتا سکتے ہو؟''حیدر نے دوبارہ اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا تو ویٹر نے انہیں راستہ سمجھا دیا۔

بل ادا کر کے تینوں دوست ہوٹل سے باہر نکلے۔علی اور حیدر جانتے تھے کہ عثمان بہت کچھ ان سے کہنا چاہتا ہے لیکن باوجود سعی کے وہ چپ ہے۔

''زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی اگر ہم لوگ کامیاب لوٹے تو؟''حیدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر لوٹے تو؟''عثمان بالآخر بول پڑا اور اس کی بات سن کر دونوں نے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

''یار کیا منہ لٹکایا ہوا ہے؟''علی پیچ و تاب کھا کر بولا۔''اس سے تو بہتر ہے تم نہ ہی ہمارا ساتھ دو۔بجائے ہماری ڈھارس بندھانے کے ہمیں الٹا ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔''

جواباً عثمان نے چپ دھار لی۔جلد ہی وہ ایک گھنے جنگل کے سامنے پہنچ گئے۔جنگل دور سے ہی بڑا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔اس کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر تینوں کے جسموں میں سرایت کر گئیں۔لیکن تینوں نے اپنی کنڈیشن ایک دوسرے پر مترشح (واضح) نہ ہونے دی۔جنگل کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔حالانکہ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں جنگل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہیں۔تینوں کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

''ہماری منزل ہم سے کچھ فاصلے پر ہے۔''عثمان گویا ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔''یہاں کھڑے ہو کے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

دونوں دوستوں نے اس کی بات کی تصحیح کی اور تینوں جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔دیو قامت اور گھنے درختوں نے جنگل کے اندر گھپ اندھیرا پیدا کیا ہوا تھا۔ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ پڑتا تھا۔تھوڑی دیر تک تینوں دوست کھڑے رہے لیکن جلد ہی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو تینوں آگے بڑھے۔

ابھی انہوں نے بمشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ یکدم انہیں یوں لگا جیسے ان کے پیچھے کوئی چیز گری ہو۔تینوں نے سرعت سے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر تینوں کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ان کے سامنے ایک عجیب و غریب شکل کا جانور کھڑا انہیں

گھور رہا تھا۔اس جانور کا منہ کتے کی مانند تھا لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی وہ بھی اس کے ماتھے کے اوپر۔اس کی آنکھ عام جانوروں کی آنکھ سے دو گنا بڑی تھی۔

اس کی زبان کتے کی مانند منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس سے پیہم رال ٹپک رہی تھی۔وہ جانور کھا جانے والی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔تینوں دوستوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔بدحواسی کے عالم میں تینوں نے پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا۔علی اور حیدر کو پہلی بار اپنی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن انہوں نے ضد کر کے اپنی جان مصیبت میں ڈال دی تھی۔

''بھاگو۔'' یکدم عثمان چلایا اور جس کا منہ جس طرف لگا اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

اس عفریت نے کھا جانے والی آنکھوں سے تینوں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے علی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔علی اس بات سے انجان پیہم دوڑے جا رہا تھا کہ یکدم اسے رکنا پڑ گیا۔کیونکہ جس طرف وہ دوڑ رہا تھا۔سامنے سے وہ عفریت آ چکا تھا۔علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔عفریت نے لپک کر علی کو پکڑا اور ہوا میں اچھالا ایک ساعت شکن چیخ علی کے حلق سے برآمد ہوئی اور جنگل کے سکوت زدہ ماحول کا سینہ چیرتی چلی گئی۔علی جیسے ہی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آیا۔اس عفریت نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا لٹکا لیا دوسرے ہی لمحے اس عفریت نے علی کے دونوں پیروں سے پکڑ کر اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔علی کے حلق سے آخری ساعت شکن درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔اس عفریت نے اس کے جسم کے دونوں حصوں کو دائیں بائیں اچھال دیا اور ایک بار پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف عثمان پیہم دوڑ رہا تھا کہ یکدم کسی سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا۔گرتے ہوئے مدھم سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔گرتے ساتھ ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے سانس میں کچھ سانس آئی۔اس سے ٹکرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ حیدر تھا۔قبل اس کے کہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے علی کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

''بھاگو۔'' عثمان نے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

''علی۔'' حیدر نے بھاگتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' عثمان دوڑتے ہوئے بولا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے آگے پیچھے سرعت سے دوڑ رہے تھے۔کافی دیر دوڑنے کے بعد جب عثمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے حواس باختہ رہ گئے کیونکہ حیدر اس کے ساتھ نہیں تھا۔اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔دو موٹے موٹے گہر ہائے آبدار اس کی آنکھوں کے پٹ کھولتے ہوئے نیچے جا گرے۔ایک بار پھر اس نے رہی سہی ہمت یکجا کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔اس کی خوش قسمتی کہ جلد ہی اسے روشنی دکھائی دینے لگ گئی۔حتیٰ کہ اس خونی جنگل سے وہ باہر نکل آیا اور ایک چٹان پر بیٹھ کر تیز تیز سانس

لینے لگا۔

اس کا سانس پھول چکا تھا۔کافی دیر چٹان پر بیٹھ کراس نے سانس بحال کیا اور جب کچھ سانس لینے میں بہتری آئی تو اس نے ادھرادھر نگاہ دوڑائی لیکن اگلا منظر دیکھ کراس کی حیرت ہو یدارہ گئی۔وہ اس غار کے دہانے کے سامنے بیٹھا تھا۔جس کے اندر نقشے کے مطابق خزانہ تھا۔جہاں اسے دوستوں کے بچھڑ جانے کا ملال تھا۔وہیں اسے خزانہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔

عثمان سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کی اور بڑھا۔غار کے اندر سورج کی کرنیں جانے کی وجہ سے کافی اجالا تھا۔عثمان آگے بڑھ رہا تھا۔تبھی اس کی نظر ایک طرف بڑے بڑے لکڑی کے صندوقوں پر پڑی۔عثمان خوشی سے پھولے نہ سمارہا تھا۔تبھی عثمان کی نگاہ ایک صندوق پر براجمان ایک ناگ پر پڑی۔ جس نے اپنا پھن پھیلایا ہوا تھا۔عثمان کو اپنے جسم میں دوڑتا لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانا نہ تھا جب اس نے سانپ کو باہر کی طرف نکلتے ہوئے دیکھا۔جب ناگ غار سے باہر نکل گیا تو عثمان جلدی سے ان صندوقوں کی طرف بڑھا جیسے جیسے وہ صندوقوں کے ڈھکنے اتار کے دیکھ رہا تھا ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔سارے صندوق لبالب ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔عثمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے صندوق لے کر چلتا بنے۔

اس نے ایک صندوق کا آخرانتخاب کیا۔اس کے اندر ہیرے جواہرات کا انبار لگا ہوا تھا۔عثمان جانتا تھا کہ وہ اتنا خزانہ تھا کہ اس کی درجنوں نسلیں پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھ کر کھاسکتی تھیں۔بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پرلادا۔اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔خوابوں کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کراس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کررہ گئے تھے۔

عثمان نے ایک ٹھنڈا مگر لمبا سانس خارج کیا اور سر پر لادا ہوا صندوق بڑی مشکل سے اتار کر زمین پر رکھا۔اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔اس کے سامنے منظر ہی اتنا بھیانک تھا کہ اسے اپنی بھیانک موت مترشح دکھائی دے رہی تھی۔سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھن پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔سانپ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

عثمان نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔اس کی آنکھوں میں اتھرو آگئے۔

''رکو میرے دوستوں مجھے بھی ساتھ لیتے جانا۔'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عثمان بولا اور پھر وہ خود کو موت کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆......☆......☆

اگلے شمارے میں انشاءاللہ ملک این اے کاوش اعوان کی قسط وار کہانی آپ کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔


آدم خور

آدم خور

تحریر: محمد خالد شاہان......صادق آباد

بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لادا۔ اس کے پائوں لڑکھڑا رہے تھے۔عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔خوابوں کے اندروہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوچکی تھی۔ جاپان کو رنگون پر حملہ کرنے کی خاطر خواہ سزا مل چکی تھی۔ میں ان دنوں بطور ای این (ریلوے) راے سر آیا ہوا تھا۔ جے پور کے شمال میں تقریباً سولہ کلومیٹر دور ایک بڑا ریلوے ٹریک زیر مرمت تھا جو تساہل پسند افروں کی وجہ سے ایک عرصے سے تعطل کا شکار تھا۔ کام اور ذمے داری کے معاملے میں انگریز واقعی خاصا اصول پرست واقع ہوا ہے اور وہ ایماندار افسروں سے کام لینا بھی جانتا ہے اور مفاجات کے مصداق میں جے پور کے ایک بڑے ریلوے جنکش آفس کی پرتعیش رہائشی کالونی سے عارضی طور پر چند ماہرین اور گڑھ والیوں (ملازموں) کے ساتھ ایک ڈاک بنگلے میں فروکش ہوگیا۔

جنگلات میں انڈر سیکرٹری شاہد صاحب کے ساتھ میں نے ایک شکاری مہم میں حصہ لیا تھا۔ جنگلات میں ایک آدم خور شیر نے گاؤں کے علاوہ اطراف میں خاصی دہشت مچا رکھی تھی۔ شاہد صاحب شکار کے رسیا تھے۔ بالخصوص درندوں کے شکار کے لیے تو ہر سے کمرے بستہ دکھائی دیتے تھے اس کی اس مہم میں میں نے بھی شوقیہ حصہ لیا۔ اور مجھے کیا معلوم تھا کہ اتفاقاً ہی مجھ سے اتنا بڑا کارنامہ ہو جائے گا جو مجھے باقاعدہ نہیں تو بے قاعدہ ہی سی۔، مجھے ہوئے شکاریوں کی فہرست میں شامل کروادے گا۔ قصہ یوں تھا تارائی۔ کے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل، کھنڈ کے کنارے ایک خوبصورت بنگلہ تھا جناں میں انڈر سیکرٹری شاہد صاحب ان کے دوست زاہد اور حیدر صاحب رہائش یہ خالصتاً شکاری مہم تھی۔ شاہد صاحب کی طرح ان کی بیوی بھی مہم جو خاتون تھیں۔

ان کی عمر تیں پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ ایک پرکشش اور دبنگ خاتون تھیں۔ زاہد اور حیدر میرے پرانے دوستوں میں سے تھے

۔ہم تینوں اکثر چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کرتے رہتے تھے۔میرے پاس یاک ڈبل بیرل رائفل تھی جس کی ایک نال میں سکہ اور دوسری نال میں چھرے ڈالے جاتے تھے چھروں سے اکثر ہم نے سہولوں ،جنگلی مرغوں اور پرندوں کا شکار کیا تھا جب کسی درندے (ریچھ یا بھیڑیا وغیرہ) سے سامنا وہ تھا تو سکے والی بیرل استعمال مئیں لاتے اگر چہ ایس اکم ہی ہوتا تھا۔

انڈر سیکرٹری شاہد صاحب شکار کے لیے رسیا تھے۔تھوڑی بہت میری بھی اان سے شناسائی تھی مگر اس مہم شناسئی کو پنپنے کا موقع اب فراہم ہوا تھا۔حیدر کا ایک دن فون آیا تھا۔

ارے یار ندیم عباس......تیار ہو جاؤ۔اب ہم چڑی مار نہیں رہے اس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

کیا مطلب......میں نے قدرے چونک کر کہا

ارے بھئی سب سے پہلے ایک لگژری بوگی بک کرالو۔پوری کی پوری۔،،اپنے سیکرٹری صاحب کے لئے۔حیدر صاحب بولا شکاری مہم پر جانا ہے ڈسٹرکٹ تارائی ان کی بیگم بھی ساتھ ہیں میں اور زاہد بھی ہوں گے تمہیں بھی چلنا ہے سمجھے اس کا انداز دستانہ آمیز تھا۔

میں نے فوراً ہی حامی بھر لی۔اس طرح اب ہم سب تارائی کے گھنے جنگلات کے بیچوں بیچ جھیل،،کھنڈ کے کنارے ایک بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔یہاں پہلے ہی سے ایک آدم خور شیر نے دہشت مچار کھی تھی کوئی بھی درندہ آدم خور نہیں ہوتا۔بھوک کی شدت شکار کی عدم دستیابی پھر عالم غیظ میں جب کسی انسان پر حملہ کر دیتا ہے تو اسے خون انسانی کی لت لگ جاتی ہے۔آدم خوری کی ایک تیسری وجہ بھی دیکھنے میں آتی ہے۔آدم خوری میں شیر عالم غیظ میں پاگل ہو جاتا ہے۔اور دیوانہ وار مائل بہ حملہ ہوتا ہے۔اس قسم کے آدم خور شیر کو ہمالیائی زبان میں گولر ،کہا جاتا ہے۔اس قسم کا آدم خور شیر نسبتاً زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ہمارا واسطہ ایسے ہی ایک گولر آدم خور شیر سے تھا۔

شاہد کے پاس پانچ سو بور کی رائفل تھی اور ہمارے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل ایکسپریس شکاری رائفلیں۔ایک دن ہم لوگ ونی کے لے اونچے درخت پر بیس فٹ کی بلندی پر مچان بنا کر بیٹھ گئے تھے۔یہ آدم خور اب تک گیارہ معصوم لوگ کو اپنا شکار بنا چکا تھا ان میں دو بچے اور تین عورتیں بھی شامل تھیں۔

کوتاہ قصہ۔،مچان سے چند گز کے فاصلے پر زمین میں کھونٹا گار کر ایک بکری چارے کے طور پر باندھ دیا گیا تھا۔آدم خور کیخلاف ہماری یہ محاذ ارائی کوئی پانچویں بار تھی اور یہاں ہمیں چھٹا دن ہو رہا تھا مگر ہر دفعہ وہ آدم خور ہم سے بچ کر صاف نکلتا رہا تھا اس بار شاہد صاحب نے میرے مشورے کے مطابق اپنے ساتھ زیادہ مزدور نہیں لے تھے۔حتیٰ کہ ان کی مسز بھی ساتھ نہ تھیں۔بس صرف ہم چاروں تھے،۔میں یعنی ندیم عباس،شاہد صاحب،حیدا اور زاہد۔

ہم دم سادھے مچان پر بیٹھے چاہر اطراف میں نظروں کی کمندیں ڈالے ہوئے تھے۔سہ پہر ہو چکی تھی۔تارائی۔کے گھنے جنگلات کا یہ وسطی علاقہ چاروں طرف سے گھنے اور چھتنار درختوں ،قد آدم پودوں اور لمبی لمبی جھاڑیوں سے گھرا ہو تھا۔فضا دم بہ خود تھی اتنی گہری خاموشی ہمارے حق میں بہتر تھی مگر اس حق کا ہم صیح استعمال نہ کر سکے اور جلد بازی کا شکار ہو گئے۔

اچانک نیچے چند گز کے فاصلے پر کھونٹے سے بندھی بر بری بکری نے پہلے ہولے ہولے اور پھر بتدریج زور زور سے منمنا شروی کر دیا۔ہم چاروں محتاط ہو گے اور اپنی آٹھ انکھیں چاوں طرف کا جائزہ لینے میں مرکوز کر ڈالیں۔ بکری نے آدم خور کی صورت میں موت کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کر لیا تھا ۔شیر کہیں آس پاس ہی تا اور غالبا اپنے شکار پر نظریں جماے کسی بھی سمت سے اچانک جھپٹے کی تیاری میں تھا۔

یوں تو ہم نے بڑے بڑے ارادے دل میں باندھ رکھے تھے۔لیکن سچی بات یہ تھی شیر کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔بکری کی روح فرسا بے چینی دیکھ کر خود میرے دل میں مارے انجانے خوف کے دھکٹ دھکٹ ہونے لگی تھی۔شاہد صاحب نے اپنی پانچ بورر ائقل کو ہلکی آواز کے ساتھ کلک کیا اور پھر دم سادھے چہار اطراف بہ غور تکنے لگا۔کسی بھی دم آدم خور بکری پر جھپٹنے واالا تھا اور ہمیں اس آدم خور کو دیکھتے ہی تاک کر گولیاں برسانی تھیں بہ صورت دیگر آدم خور غضب ناک ہو کر ساری مچان پر زقند بھر سکتا تھا۔

اگلے ہی لمحے ہمارے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ابھری اور پھر لگ بھ چھ فٹ ک ایک غیر معمولی لمبے اور قوی الجثہ بیر شیر نے بکر کو آ دبوچا

ہدف کو چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے جوش اور خوشی کے ملے جلے احساس نے عجلت کے شاخسانے کو جنم دیا اور سب سے پہلے شاہد صاحب نے آدم خور کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کر ڈالا ۔

ساکت فضاء میں پانچ سو بور اور پونے تین س میگنم کے ایل جی پی،،،کارتوس کا فکان پھاڑ دھما کا ہوا اور ایک چھرا کارتوس کا نشانہ خطا ہو گیا ۔آدم خور شیر نے شکار چھوڑ کر ایک غضب ناک دھاڑ ماری اور سیدھا مچان کی طرف جست بھری۔آدم خور کو غضب ناک عالم میں اپنی جانب متوجہ پا کر ہم باقی تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔زاہد اور حیدر کے ہاتھوں سے تو بندوقیں چھوٹ کر گر پڑیں لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور تاک کر آدم خور شیر پر تلے اور دو فائر جھونک مارے۔دونوں نشانے پر لگ اور شیر ہماری مچان سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر آخری دھاڑ کے ساتھ بھد سے جھاڑیوں میں گرا۔

شاہد صاحب ہنوز سناٹے کے عالم میں تھے۔زاہد اور حیدر کے چہروں پر تسعجاب انگیز خوشی۔آثار چھوڑے ہوئے تھی بندوقوں کا دھماکوں سے تارائی کے پورے جنگل کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔چرند پرند کا احتجاج آمیز شور سا مچ گیا تھا۔پس قصہ کوتاہ،،یہی وہ موقع تھا جب میرا اشما رشکاریوں میں ہونے لگا تھا

☆......☆......☆

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ان دنوں میں بطور ریلوے ای این ارا ے سر آیا ہوا تھا اور اپنے مختصر سے عملے کے ساتھ ڈاک بنگلے میں فروکش تھا ریلو ے ٹریک کی مرمت کا کام آخری مراحل میں تھا۔ایک روز فلو کے باعث میں نے سائٹ پر جانے کی بجائے بنگلے رپ ہی ذرا دیر آرام کرنے کو ترجیح دی۔ویسے کام بھی آخری مراحل پر خاصل تسلی بخش انداز میں انجام پذیر تھا۔س لیے تھوڑا آرام کرنے کو دل چاہا۔ ماگھ کی بھیگی راتوں والی خوشگوار صبح تھیں رات بھر موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی اور اگلے دن تیز دھوپ نکل آتی ۔بلند وبالا اور گھنے درختوں کی ہری بھری شاخیں ڈھل

کرنکر جاتیں۔

میں اس سے بنگلے کے باغیچے میں کرسی ڈالے موجود تھا ناشتہ میں نے ادھر ہی ایک فولڈنگ ٹیبل پر کیا تھا۔ اب چائے پیتے ہوئے گزشتہ شب کی بارشوں میں بھیگی ہوئی صبح کی تازگی کو اپنے اندر منتقل کر رہا تھا بنگلے کا یہ باغیچہ مختصر ضرور تھا لیکن خوبصورت رنگا رنگ پھولوں اور سرسبز بیلو ں سے لدا ہوا تھا۔ فرش۔ بیز مہین گھاس سے مزین تھا پودوں اور گھاس کی نرم و نازک پتیوں پر شبنمی قطرے روپہلے موتیوں کی طرح دمک رہے تھا۔ دور سرسبز ڈھلوانوں والی فلک بوس عمارتوں پر ہرن سانبھر اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے بڑے جانور قلانچیں بھرتے نظر آرہے تھے۔ شمال کی سمت خوش رنگ پرندوں کی منظم ڈاریں بڑی سب روی کے ساتھ محو پرواز تھیں تو ایک جانب بلند و بالا بانس دیوار اور تاڑ کے درختوں سے پرے پیالہ نما ہری بھری وادیوں میں سنبھولوں اور سرخ کلغیوں والے جنگلی مرگوں کے جنڈ کے جھنڈ آرانوں میں مصروف تھے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے رامو میرے سامنے سے ناشتے کے برتن اٹھا لے گیا تھا مین اس چہار سو پھیلے حسین مناظر کی دلکشی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میرے کانوں سے موٹر گاڑی کے انجن کی کھرکھراتی آواز ٹکرائی، میں نے چونک کر لان سے باہر وسیع احاطے کی طرف نظریں گھمائیں تو بے اختیار میرے قدم گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ سامنے پرانے ماڈل کی خاکی ہڈ والی لینڈ کروزر کھڑی تھی یونٹ کیساتھ ڈگارڈ پر جھو لتے مخصوص مونوگرام والے پھریرے کو دیکھتے ہی میں نے بھنویں اچکا دیں لینڈ کروزر کے چاروں سمتوں والے دروازے کھلے وہ پانچ افراد تھے۔ دو افراد کو دیکھ کر میں چونکنے کے ساتھ ایک متوقع سی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ دونوں شناسا افراد میرے لنگو ٹیے یار زاہد اور حیدر تھے اس سے وہ دونوں نے کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کا قد وقامت ٹھگنا اور گھٹا ہوا تھا البتہ ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے ساتھ والی سیٹ سیاتر نے والے وہ تھا کہ صاحب بیوی تھے۔

مونوگرام والے پرھیرے سے میں نے پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ صاحب موصوف آر او تھے آر او صاحب خاصے لمبے تڑنگے اور اچھی صحت کے مالک تھے۔ بیوی ان کی دبلی تپلی اور خوبصورت تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر خوشدلی سے ان کا استقبال کرتے ہوئے مصافے کیلیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

''ندیم عباس ......ای این ریلوے''

اور اس نے کہا میں شاہان جواب آر او ساحب نے خوش دلی سے اپنا تعارف کرایا۔

زاہد اور حیدر نے کہا ہمیں معلوم تھا کہ تو ادھر ہی ہے۔

تیرے کو سرپرائز دیں گے، زاہد نے خالص کاٹھیاواڑی لہجے میں کہا اور میں بے اختیار مسکرا یا دیا میں ذارکم گو واقع ہو تھا رسمی کلمات کے تبادلے کے دوران ہم اندہال کے کمرے میں آکر بیٹھ گے۔

شاہان یہ ندیم ہے ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔ ایک برے صوفے پر اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دھنستے ہوئے حیدر نے آر او صاحب سے میرا تفصیلی تعارف کراتے ہو کہا۔ یہی وہ نڈر شکاری ہے جب انہوں نے اپنے سیکرٹری شاہد صاحب کو نارائی کے ایک آدم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



خورشیر کے خونی پنجوں سے بچایا تھا اور کمال پھرتی سے اس آدم خور شیر کو موقع پر ڈھیر کر دیا تھا او ویری نائس،،شاہان کے منہ سے بے ختیارا میرے لیے توصیفی کلمات نکلے۔پھر شاہان صاحب نے اپنے جیب سے سگریٹ نکلی اور دیا سلائی سے اسے سگایا اور جلدی جلدی سے دو تین کش لگائے۔سگریٹ پوری طرح جل اٹھا۔پھر وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا تے ہوئے پہلو بدل کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

ندیم عباس صاحب......اس سے پہلے آپ نے اور کہاں کہاں شکار کھیلا ہے،میرا مطلب ہے تارائی کے علاوہ ؟ان کا انداز انٹر ویو لینے کا سا تھا۔

میں ہولے سے کھنکار کر پر اعتماد لہجے میں بولا اس سے پہلے میں نے بہت سی جگہوں پر شکار کیا ہے اور میرا آدم خور درندوں سے کم ہی واسطہ پڑا ہے میں شوقیہ ہی شکار کھیلتا ہوں۔

گڈ......شاہان صاحب نے مخصوص لہجے میں کہتے ہوئے دھواں اگلا اور فضا میں بکھرے کثیف دھوئیں کے مرغولوں میں انہوں نے نظریں گاڑ دیں۔

جناب...... یہ چھپا رستم ہے......اس نے رحیم آباد کے ساڑھے سات فٹ لمبے آدم خور کو بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا،اس کا نشانہ کمال کا ہے۔اس بار زاہد نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور جانے کو ین میری چھٹی حس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی یہاں اچانک آمد کسی ایسی ہی شکاری مہم کا شاخسانہ لگی ہے۔

جس میں یہ لوگ مجھے بھی شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔یہ سوچ کر مجھے انوکھی مسرت کا احساس ہونے لگا۔

ویل ندیم عباس صاحب......اس کا مطلب ہے تمہارے بغیر ہماری مہم نا مکمل ہو گی۔شاہان صاحب کی گفتگو سے میرے خوش فہم خیالات کی تصدیق ہو گئی۔تاہم میں بھی پہلو بچائے رکھتے ہوئے انجان سا بنا رہا

میرا خیال ہے شاہان صاحب......ندیم عباس سے تفصیلی بات کر لینی چاہیے

اچانک زاہد نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف تکتے ہوئے شاہان سے کہا اور انہوں نے جوابا دھیرے سے مسکرا کر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

دیکھو بھئی سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا یہاں کام کتنا باقی رہ گیا ہے۔حیدر نے مجھ سے پوچھا۔

میرا خیال ہے میں پہلے آپ لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لوں پھر تفصیل سے گفتگو ہو گئی میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

شاہان صاحب نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔نو لیواٹ۔ہمارا ملازم شانی ساتھ ہے۔ہمارے کھانے پینے کا بھی سارا سامان ہے۔ ہمارے پاس یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی مسز کی طرف دیکھا۔وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اسی اثناء میں شانی اور رامو مختلف ساز و سامان اٹھا اندر آ گے پھر دونوں ملازم ہمارے آگے رکھی خاصی چوڑی ٹیبل پر ہلکی ہلکی اشیائے خورد و نوش سرو کرنے لگے۔

حیدر اپنی بات دہرانے کی بجاے مستفرانہ نظروں سے میری طرف تکنے لگا اور ادھر شاہان صاحب بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تو میں نے ذار کھنکار کر جواباً کہا۔میرا کام اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔میرا خیال ہے تین چار روز میں یہاں سے فارغ ہو جاؤں گا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ میں ابھی فارغ ہوں اس لیے یہاں نظر آ رہا ہوں ورنہ اسوقت میں سائٹ پر ہوتا۔میں نے اپنی بات مکمل کی۔

زاہد،رامو سے چائے لیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔بھی ندیم !تم اب اپنے آپ فارغ ہی سمجھو،ہم دراصل یہاں سے سولہ کلومیٹر دور شمال کے علاقے میں جانے کاارادہ رکھتے ہیں وہاں سنا ہے۔کافی عرصے سے ایک آدم خور شیر نے دہشت پھیلا رکھی ہے اور اب تک اس علاقے اور آس پاس کے علاقے کے کم از کم سو ڈیڑھ سو معصوم انسانوں کی جان سے مار چکا ہے۔

زاہد اتنا کہہ کر لمحے بھر کو رکا تو یکدم سے میرے دل دھڑکنیں تیز ہو گئیں مجھے حیرت تھی کہ خود مجھے یہاں سے راے سر میں راہتے ہوئے پندرہ سولہ روز ہو چکے تھے میرے کانوں تک اس آدم خور کی شہرت کیوں نہ پہنچی؟

میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ حیدر نے لقمہ دینا ضروری سمجھا اور تم ندیم عباس،،ہماری اس مہم میں ضرور شامل رہو گے بلکہ شامل ہو چکے ہو۔،ہم ابھی اپنی تھکان اتاریں گے پھر ایک دو گھنٹوں بعد تمہارے ساتھ ماگھ پتی روانہ ہو جائیں گے۔وہاں کے سردار صاحب ہمارے دوپہرے کے بھوجن پر ہمارے منتظر ہوں گے۔میں نے اس کی بات بغور سنی اور دھیرے سے پرخیال انداز میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ ماگھ پتی کے آدم خور سے متعلق اور شکاری رالفلوں کی جانچ پڑتال میں گزر گیا۔اس دوران میں نے زاہد اور حیدر سے اپنے دل کی الجھن نہ چھپا سکا اور اس خیال کا اظہار کر ہی ڈالا۔آخر مجھے ادھر راے سر میں رہتے ہوئے اس آدم خور کے بارے میں کیوں کچھ معلوم نہ ہوا!

آسان سی وجہ ہے اس کی،،،حیدر نے کندھے اچکا کر کہا اور اپنی بات مکمل کی۔یہ آدم خور پر اسرار سا واقع ہو ہے۔جس کے بارے میں ابھی تک یہ ہی نہیں پتہ چل سکا کہ وہ کس نسل کا ہے۔،شیر ہے چیتا ہے یا گلدار،،

کیا مطلب ہے میں نے چونکے بنا نہیں رہ سکا لیکن حیدر نے میری بات سے صرف نظر کرتے ہوئے بدستوار اسرار بھرے لہجے میں بتانے لگا اس آدم خور کو کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔وہ پر اسرار طور پر کسی بھی بھولے بھٹکے شخص کو چپکے سے اٹھا کر لے جاتا ہے اور بد نصیب کی پھر اگلے دن لاش ہی ملتی ہے اور بھی باقیات کی صورت میں۔

میں یہ تفصیل سن کر متحیر سا رہ گی۔ی تو مجھے جن بھوت والا معاملہ لگتا ہے بے اختیار میے منہ سے نکلا تھا۔

بہر طور اس پر اسرار آدم خور سے دو دو ہاتھ کرنے کو میرا دل کشاں کشاں اس علاقے میں جانے کو بے چین ہو چلا تھا میں نے رامو کو ضروری ہدایت دیں اور پھر مختصر سا ریڈی میڈ بوریا بسر باندھا اپنی ایکسپریس رائفل ٹکڑوں کی حالت میں بریف کیس میں ڈالی اور عازم ہوا

☆......☆......☆

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔،،پور جنگل تاریکی مس ڈوبا ہوا تھا شراٹے دار بارش اور بجلی کی گرج چمک سے پورا جنگل گونجتا ہوا سا محسوس

ہو رہا تھا۔ ہم سہ پر تک وہاں پہنچ چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا سردار کی حویلی میں ہم نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ ان کا صرار تھا کہ ہم ابھی حویلی میں عارضی طور پر رہائش پذیر ہو کر آدم خور کی بیخ کُنی کی مہم کا پورے سکون کے ساتھ آغاز کریں مگر ہم نے انتہائی شکریے کے ساتھ ان سے معذرت کی اور پرھ انہوں نے جنگل کے وسط میں بنے ایک شکاری بنگلے کی صفائی کروا کر فی الفور قابل رہائش بنایا اور اب ہم ایک بڑے ہال کمرے اور دو چھوٹے کمروں کے اس چوکور بنگلے میں موجود تھے۔ سرادر صاحب نے اپنے ملازموں کی ایک کثیر تعداد ہمیں تفویض کرنی چاہی تھی لیکن ہم نے صرف ان کا ایک ملازم مانا ساتھ رکھ لیا تھا وہ بھی اس لے کہ آس پاس کے علاقے کا وہ شنا سا تھا

اس سے تو ہم سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے شاہان صاحب اپنے کمرے میں جا سوئے تھے۔ زاہد بھی تھکا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ بھی اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ یہ دوسرا کمرہ ہم تینوں مشترکہ تھے یہاں پہلے اپنی حویلی سے ایک بیڈ ادھر ڈلوا دیا تھا مگر میں اور حیدر نے ہال کمرے میں ہی سونے کو ترجیح دی تھی جہاں ایک بڑے صوفے میں وہ خود بھی پڑا خراٹے لے رہا تھا

جبکہ پتہ نہیں کیوں نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی

یہ ہال کمرہ اتنا زیادہ بڑا تو نہ تھا البتہ اس کی چھت خاصی بلند تھی فرش لکڑی کا۔ تھا۔ درحقیقت یہ بنگلہ زمین کی سطح س پانچ فٹ بلندی پر تھا جس کے نیچے خود رو جھاڑیوں اُگ آتی تھیں۔ چوبی کڑیوں والی چھت محراب دار تھی اور خاصی کہن سالی کا نمونہ پیش کر رہی تھیں ایک آتش دان بھی تھا جو ظاہر ہے ابھی سرد پڑا تھا کیونکہ سردی کا موسم نہ تھا۔ شمالاً جنوباً جال دار شیشے کے شٹر والی کھڑکیاں تھیں۔ مغربی سمت میں داخلی دروازہ اور شرقاً دو کمرے بنے ہوئے تھے یہ شکاری بنگلہ سرادر کی حویلی تھی۔ وسطی جنگلات کا علاقہ ادھر سے ہی شروع ہوتا تھا۔ باہر بادلوں کی گڑ گڑاہٹ اور گھنے چوڑے پتیوں والے درختوں پر بارش کی شراٹے دار پھوار جاری تھیں کمرے میں پٹیر ولکس کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چارپائی پر کافی دیر تک بے خوابی کے عالم میں کروٹیں بدلنے کے بعد جھلا کر اٹھ بیٹھا اور سگریٹ سلگا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ایک دو کش لینے کے دوران دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا اور اس کی دیوار گیر چوکھٹ سے ٹیک لگا کر باہر گھنے جنگل میں رہ رہ کر جتی چمکتی بجلی اور بارش کو تکنے لگا۔

کھڑکی کے ایئر ٹائٹ شیشے پر بارش کی بوندیں کاریزیں سی بناتی محسوس ہو رہی تھیں۔ لکیروں کا جال سا تھا جو شیشے پر پھیل گیا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو سامنے دور تک پھیلا ہوا ویران جنگل روشن ہو جاتا۔ اچانک بجلی چمکنے کے دوران میری نظر ایک سائے پر پڑی۔ میں یقن سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسانی سایہ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک شکاری رائفل تھی اور اس کا حلیہ بھی کسی شکاری جیسا ہی محسوس ہوا تھا تا ہم اس نے پتلون کی جگہ نیکر پہن رکھی تھی میں نے ذرا چونک کر پھر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس بار وہ نظر نہ آیا۔ پھر اچانک جب بجلی چمکی تو مجھے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ بالکل چپکا ہوا ایک بدہیت چہرہ دکھائی دیا اور میرا دل جیسے کسی نے یکدم مٹھی میں جکڑ لیا۔ غیرارادی طور پر مین کھڑکی سے چند قدم پیچھے کو ہوا اور لڑکھڑا سا گیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سی چیکٹ داڑھی بھنویں اتنی گھنی کہ آنکھوں تک کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ یہی حال بالوں کا تھا جو جٹاؤں کی طرح چوٹیاں کی صورت جھول رہے تھے۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ مجھے کسی صورت بھی پانی میں بھیگا ہوا محسوس نہیں ہو رہا

تھا۔حلانکہ باہر بڑی دھواں دھار بارش ہورہی تھی وہ ہنوز کھڑکی کے شیشے سے چپکا میری طرف گھور ہا تھا۔بغور دیکھنے پر مجھے اس کے کاندھے سے جھانکتی ہوئی شکاری رائفل کی نال بھی دکھائی دی تھی۔یہ وہی شکاری تھا جس کی جھلک ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے دیکھی تھی۔

اسے لمحے جب دوبارہ بجلی چمکی تو وہ چہرہ غائب ہوچکا تھا۔

پتہ نہیں کون تھا،،،میرے منہ سے بڑبڑاہٹ آمیز جملہ نکلا اور پھر کھڑکی کے قریب آکر باہر برستے موسم کا نظارہ کرنے لگا اس پراسرار شکاری کے چہرے کے نقوش میرے ذہن میں ثبت ہوچکے تھے پھر اچانک مجھے نیند ستانے لگی اور رات کا یہ لمحہ بھر پراسرا واقعہ میرے ذہن سے صبح تک محو ہوچکا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ناشتے کے فوراً بعد سرادر صاحب کے ارسال کردہ ایک ادھر پالی کو اپنی چھ رکنی ہسٹنگ ٹیم میں شامل کرکے آدم خور کی گوشالی کے لئے نکل کھڑے ہوئے شنید یہی تھی کہ اس ان دیکھے آدم خور نے آس پاس کے علاقے میں کافی دہشت مچارکھی تھیاوراب تک سو سے زاہد معصوم انسانوں کو اپنی مردم خوری کی بھنیٹ چرھا چکا تھا میری جانے کیوں سرشت ایسی تھی کہ مجھے کسی بھی معاملے کا کوئی نہ کوئی پراسرار پہلو کھٹکتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی دو پراسرا باتوں نے مجھ آدم خور نیا لجھا سا دیا تھا۔اور میری رگ پراسراہت کو ہوا دینے کا باعث بنی تھی۔اس آدم خور کو آج تک کسی نے دیکھا نہیں تھا اور واقعی ایک حیران کن تھا دوسری بات یہ کہ پراسرار آدم خور نے اب تک صرف مردوں کو ہی اپنی آتش شکم کا نشانہ بنایا تھا جبکہ ایسے درندے یعنی چیتا شیر گلدار یا تیندوے جب آدم خوری کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی مردم خور کی مرد، عورت،حتی کہ بچے بلاتخصیص بھینٹ چڑھنے لگتے ہیں کیونکہ انہیں تو انسانی خون کی لت لگ چک ہوتی ہے،نا کہ مرد یا عورت کی آدم خور کے ان پراسرار پہلوؤں پر سوچ و بچار کے دوران مجھے شاہان صاحب اور زاہد پر بھی حیرت تھی کہ انہوں نے آخر ان پہلوؤں کو کیوں نظر انداز کیا تھا تاہم میں نے دوران مہم خود ہی اس بات کا اظہار شاہان صاحب سے کیا۔اس وقت سہ پہر ہوچلی تھی مگر ہم سب تازہ دم تھے۔میں نے شاہان صاحب سے جب اس نادیدہ مردم خور کے بارمیں ان دورپ اسرار پہلوؤں کیطرف توجہ مذول کروائی تو وہ بھیدوں بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے ان میں پائپ دبا کر مخصوص لہجے میں بولے:

ویل ندیم عباس،،میں خود اس ادھیڑبن میں مبتلا ہوں لیکن،انہوں نے نجانے کیوں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔پھر لمحہ بھر توقف کے بعد پر خیال لہجے میں بولے ویسے آسام کے جنگلوں میں،میں نے ایک ایسا ہی پراسرار آدم خور شکار کیا تھا۔وہ آدم خور شیرنی تھی۔جو صرف بچوں یا عورتوں کا شکار کرتی تھی۔لیکن اس کی بھی ایک وجہ تھی میں نے شیرنی کو ہلاک کیا تو اس کے اگلے دونوں پنچوں کے ناخن ٹوٹے ہوئے تھے بلکہ اس کے جبڑے کے دو اوپری دانت بھی غائب تھے۔عورت اور بچے اس کے لیے سہل شکار ہوتے تھے۔اس میں اس کی معذوری کو دخل تھا مگر جب اس کی دہشت چاوانگ پھیلی تھی تو آس پاس کے بستی والوں نے اپنی آنکھوں سے اس آدمی خور شیرنی کو انسانوں پر حملہ رکتے دیکھا تھا۔مگر اس آدم خور کو تو ابھی تک کوئی انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکی تھی جبکہ ماگھ پتی کا یہ آدم خور اب تک سو سے زائد معصوم انسانوں کو ہلاک کرچکا

ہے۔

شاہان صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔اور پائپ کے گہرے کش لینے لگے۔پھر ہماری گفتگو حیدر اور زاہد بھی شامل ہو گئے۔مسز شاہان کو اپنے کمرے میں محدود رہنے کی ہدایت کر دی گئی تھی میں نے اچانک مانا پوچھا: مانا یہ بتاؤ اس آدم خور کو کیا واقعی اب تک کسی نے نہیں دیکھا ہے

نہیں لالہ ساری وپروائی کیا بلکہ آرے دور زے کسی منش نے آج تک اس آدم خور کو نہیں دیکھا۔مانا نے بتایا

اچھا،، یہ بتاؤ آخری بار اس آدم خور نے کس بدنصیب کو نشانہ بنایا اور کب؟ میں نے پوچھا

مانا کچھ سوچ کر فوراً بولا۔ابھی دو دن پہلے کی بات ہے۔ادوھر رمنا گھاٹ پر ریشماں کا شوہر اس آدم خور کا نشانہ بنا ہے

تم ہمیں ابھی ریشماں کے پاس لے چلو، میں نے کہا اور وہ فوراً تیار ہو گیا۔پھر ہم سب اپنی شکاری رائفلوں کے ساتھ مانا کے ساتھ ریشماں کے گھر کی طرف چل پڑے۔جنگل بہت گھنا تھا۔سہ پہر وہتے ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔پرندوں کے چہکار تک معدوم تھا ایک ہو ناک سناٹا تھا۔جو ہر سو چھایا ہوا تھا۔جا بجا بانس کے پودے اور چوڑے پتوں والے قد آدم درختوں کی بہتات تھی۔اس پر مستزادکاندھوں تک خودرو جھاڑیوں بھی حائل تھی۔مگر ہم سب اس پراسرار آدم خور کی سرکوبی کے جوش فروزاں میں بتلا مانا کے پیچھے پیچھے بلاخوف چلا رہے تھے۔

دفعتہً میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔پورب کی طر ف ساٹھ میٹر کے فاصلے پر مجھے دو تین موٹے تنے والے لحیم شحیم اور کہنہ سال برگدوں کے قدرتی سنگم کے عین بلدن ی پر مچان نما یک چھونپڑی دکھائی دی ایک لمحے کو میر اذہیں چونکا۔کوئی اور وقت ہوتا تو وقت ہوتا تو میں اس عجیب و غریب ساخت کی چھونپڑی کی طرف جرور کشاں کشاں قدم بڑھاتا مگر اسوقت مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی مگر میں نے چلتے چلتے پھر بھی مانا اس ویران میں بنی چھونپڑی کے بارمیں ضرور پوچھا اس نے بتایا۔

لالہ جی یہاں رہتا ہے ایک پاگل،،، خود کو بڑا ماہر شکاری کہتا ہے۔پر اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے ہاں اس کے پاس ایک رائفل ہے وہ سکے والی ہے جو اس نے پاگل ہونے کے باوجود اب تک نہیں چلائی۔

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا

تھوڑی ہی دیر بعد اس مچان نما جھونپڑی سے ایک مجہول سا شخص نمودار ہوا۔اس کے ہاتھ میں قدیم ساختہ رائفل دبی ہوئی تھی۔میں اسے دیکھتے ہی بری طرح ٹھٹکا۔

یہ وہی پاگل شکاری تھا جسے میں نے گزشتہ دھواں دھار بارش شب میں اپنے بنگلے کے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا اور پھر جس طرح اچانک نظر آیا تھا۔وہ اسی طرح پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔

اب میں ذرا رک کر اس کی طرف بغور دیکھے جا رہا تھا۔جھکے جھکے کاندھے کھچڑی سے بال اور چہرے پر پراسراریت کے علاوہ اس کی آنکھو ں میں عجیب وحشیانہ سی چمک وہ ایدتھی۔جانے کیوں اس کی وضع قطع کو بغور دیکھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی چلیں لالہ جی!

وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں معا ماتا نے مجھے ٹہوکا دیا اور میں اس رپ اسرار اور جھکی شکاری کی جانب سے نظریں ہٹا کر آگے بڑھ گیا

تھوڑی دیر بعد ہم ایک جھونپڑ بستی میں داخل ہوگے۔ یہاں جابجا ڈھلوانی چھتوں والی کھپریل اور کجروں کی جھونپڑوں بنی ہوئی تھی۔ یہ غربت کی ماری بستی معلوم ہورہی تھی۔ بچے ننگ دھڑنگ اور ادھرادھر کھیلتے بھاگتےنظر آرہے تھے۔ مردوں کی اوپری جسم بالکل برہنہ اور نیچے میلی چیکٹ دھوتی تھی۔ پسلیاں صاف نظر آرہی تھی اور رنگت بالکل سیاہ تھی۔ عورتیں اورلڑکی بالیاں بھی ستی سی سوتی کپڑے اور مختصر دھانی بلاوز میں ملبوس تھیں۔

بہر طور ہم سب رمنا گھاٹ کےقریب واقع میئر کی بدنصیب ریشماں کے پاس پہنچے۔۔اس بچاری کی حالت دیکھ کر ہمارادل پسیج گیا۔۔ہم جھونپڑی کی چوکٹ پر ہی کھڑے رہ گے تھے۔ جہاں پردے کےطور پر مستعمل ایک چیتھڑا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ریشماں ذرا باہرآ،،،صاحب آئے ہیں،، کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تم سے اندر سے ایک بچے کو گود میں اٹھائےتیں پنیتیس سالہ گہری رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی۔اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ گہری اداسی کا غماض تھا۔ یہ عمراس کی بیوگیکی نہ تھی،،ایسے میں تین چار،،شاید اس بھی زیدادہ بچوں کی فوج ظفر موج نمودار ہوئے تھےاوراپنی معصومانہ آنکھوں میں حیرت سموئےہمیں ٹکرٹکر گھورے جارہے تھے۔

بدنصیب ریشماں نے میلے پلو سے اپنا چہرہ پونچھااور ہماری طرف خاموش نگاہوں سے تکنےلگیا یسے واستو نے آگے بڑھ کراس مخاطب ہوکر ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

بہن جی،ہمیں آپ کے پتی کاافسوس ہوا۔۔جواللہ کومنظور،ہم آپ کے دکھ کے برابر کےشریک ہیں۔۔ہم اس آدم خور کو ہلاک کرنے ہی اس علاقے میں آئے ہیں۔کیا تم ہمیں اس واقعہ کی تھوڑی تفصیل بتاسکوگی؟

اس عورت کی آنکھیں جھلملاسی گئیں۔صاف محسوس ہوتا تھا۔ کہ یہ سب بتانے میں اسے گہرے دکھ کی پھروہی کڑوی گولی نگلنی پڑی رہی تھی۔مگر یہ سب بھی ضروری تھا۔کم ازکم اس آدم خور کا جلدازجلد خاتمہ تو ممکن ہوسکتا تھا تا کہ وہ پھرکی کو اپنے خونی پنجوں کا نشانہ نہ بنا سکے۔

جی میں گھاٹ پر کپڑے دھورہی تھی۔اس نے فسردہ سے انداز میں بتایا"میراشوہر جنگل میں سرادر صاحب کی بھیڑیں چرانے گیا ہواتھا۔ وہیں اس آدم خور نے حملہ کرکےمیرے شوہر کو،،اتنا بتاتے ہوئے اس بچاری کا جی بھرآیا اوروہ پلو منہ میں دبا کر سکنے لگی۔

اس آدم خور کو کسی نے دیکھا بھی تھا۔۔میں نے ذرا دیر بعد پوچھا

نہیں۔نرملا نے خود پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔میرے شوہر کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھی تھی۔پوروائی کے سبھی لوگوں نے یہی کہا کہ میراشوہر اس آدم خور کے خونی پنجوں کا شکار ہوا ہے۔

لیکن آس پاس کسی نے اس آدم خور کے پنجوں کینشان تو دیکھنے کی کوشش کی ہوگی اس بار زاہد نے بدنصیب عورت سے پوچھااوراس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی اوراچانک پورے گاؤں میں آدم خور آیا،آدم خور آیا۔کاشور مچ گیا۔

اس شور پر ہم سب بری طرح ٹھٹھک گے۔ریشماں بیچاری دہشت زدہ ہوکراپنے بچوں کو مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر جھونپڑی

کے اندر بھاگ گئی۔ہم سب چند ثانیئے ہکابکاایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔پوری آبادی میں ایک غدر ساچ گیا۔ایسی بھگڈر مچ گئی تھی کہ ہر کوئی دہشت زدہ ہوکر اپنے ٹھکانوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔میرا دل زورزور سے دھڑ دھڑانے لگا۔

کرنل شاہان صاحب،زاہداور حیدر کے چہروں پرایکا یکی چوکنا پن کھنڈ آیا تھا

مگر بے چارہ مانااس افتادنا گہانی پرسرسیمہ ہونے لگا تھا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسا آدم خورتھا جو یوں دندتا ہوا آبادی میں گھس آیا تھا ۔آثار تو یہی بتارہے تھے جیسے یہ آدم خور کسی بھیا نک بلا کی طرح یہاں آن وارد ہوا تھابلا آخر میں نے ذرا ہمت کرکے قریب سے دوڑتے ہوئے ایک دہشت زدہ شخص کوروکتے ہوئے پوچھا۔اے بھائی! کچھ تو بتاؤ وہ آدم خور ہے کدھر؟ ہم اسے ابھی ہلاک کرڈالیں گے۔

میری بات سن کراس نے بمشکل ہانپتے ہوئے بتایا کہ جنگل کی سمت آدم خور کی جھلک نظر آئی جہاں جہاں اس نے کسی آتو نامی شخص کانرخرہ دبوچ لیا ہے بس پھر کیا تھا۔۔ہم سب اپنی اپنی شکاری رائفلوں اٹھایا مذکورہ سمت کی طرف دوڑے۔آدم خور کو دیکھنے کے جوش سے مرے دل ودماغ میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی کیونکہ اس آدم خور کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ آدم خور ایک شخص کو بھنبور رک شگم سیری میں مصروف تھا۔

ہم طوفانی رفتار سے ارئفلیں اٹھائے اس مقام کی طرف دوڑ پڑے۔میرے دل میں اس پراسرار آدم خور کو ہلاک کرنے سے کہیں زیادہ اسے دیکھنےس کی خواہش شدت سے ابھری ہوتھی۔

اس پراسرا آدم خور کونابود کرنے کا سب زیادہ جوش کرنل شاہان صاحب میں اور دیکھنے کا اشتیاق مجھ میں پایا جاتا تھا۔وہی سب سے آگے دوڑے تھے۔اس کے بعد میں تھااور میرے پیچھے زاہداور حیدر،،بے چارہ مانا تو خوف سے پہلے ہی کہیں سٹک گیا تھاجاے وقوعہ تک پہنچتے میں بمشکل پندرہ منٹ لگے تھے وہ ایک جگہ ایک پہاڑی چشمے کے قریب تھی۔یہاں قدآدم خورروجھاڑیوں کے علاوہ منیلا اور کاڑکے درختوں کی بہتات تھی۔میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔یہی حالت باقی تینوں کی بھی تھی۔یہاں پہنچ کر ہم چاروں رک گئے تھےاور چوکنا نظروں سے بہتے چشمے کے قدرتی موڑ کے طرف بغور دیکھنے کی کوشش کررہے تھے فضا میں سوائے بہتے چشمے کی قل قل کے سواکوئی آواز نہ تھی۔مذکورہ سمت ہمیں کچھ نظر نہیں آیا ہم سب جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔مگر ہمیں آدم خوراپنے۔شکارسمیت کہیں دکھائی نہیں دیا۔کسی نے ہمارے ساتھ کھلواڑنہیں کیا۔

یہ زاہد تھا۔اس کی سرگوشی میں ڈوبی ہوئی آواز چندقدم آگے متلاشی نظروں دوڑاتے ہوئے کرنل شاہان صاحب کو کھل گئی۔اس نے فوراہا تھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی،،،مس نے اپنی رائفل چوکنا انداز میں سنبھال رکھی تھی اچانک مین نے کرنل شاہان صاحب کوقدرے ٹھٹکے ہوئے دیکھا وہ بار بار ہماری طرف وصامت وجودمیں ایک غیر محسوس سی جنبش پیدا ہوئی تھی۔۔وہ بار بار ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پرانگلی ہوئے ہمیں ذارابھی آواز نہ پیدا کرنے کی مسلسل تلقین کے جارہا تھا۔

چندلمحوں بعد کرنل شاہان صاحب ہمیں اپنی جگہ پردبکےرہنے کا اشارہ کرتے ہوے خودآگے سرک گیا۔

یہ کدھر کو ہولیا! اس بار حیدر بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی میں نے جل کر کہا، مجھے کیا معلوم لگتا ہے اس نے آدم خور کو سانسوں کی بازگشت سن لی ہے زاہد کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر میرے جی میں آئی کے میں بھی کرنل شاہان صاحب کے عقب میں بڑھنے لگا تو۔،، میرے پیچھے زاہد اور حیدر، نے بھی قدم آگے بڑھا دیئے۔ میری چوکنا اور متلاشی نظریں،، اس سمت میں جم کر رہ گئی جدھر قد آدم جھاڑیوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے میں نے ٹھٹکے ہوئے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کرنل شاہان صاحب کے متعلق سوچا۔ جو ہمیں یہ بتائے بغیر خاموشی سے نامعلوم مقام کی طرف بڑھ گیا تھا۔ آخر ایسا کیا محسوس ہوا تھا۔

ابھی،، میں گھنے جھنڈ کے ڈھینگروں سے ذرا فاصلے پر ہی تھا کہ معامری ے قدم ایک عجیب سی آواز پر رک گے۔ پہلے تو اس آواز پر ہی میری روح فنا ہوگئی تھی کیونکہ ایک عجیب سی آواز پر رک گئے۔ پہلے تو اس آواز پر ہی میری روح فنا ہوگی تھی۔

کیونکہ شروع میں یہ آواز ایسی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی خشک پتوں پر چل رہا ہو۔۔ چرمراتے پتوں کی ہلکی سرسراہٹ آمیز آواز سے میں نے یہی سمجھا تھا کہیں پراسرار آدم خور میری گھات میں تو نہیں آ رہا تھا مگر پھر دوسرے لمحے جب ذرا اٹھرا کر مینے شکارانہ یکسوئی کے ساتھ اس ہلکی ہلکی ابھرنے والی آواز پر کان دھرے تو مجھے اپنے اس خوفناک خدشے کو رد کرنا پڑا کوئی درندہ میری گھات میں بیٹھا تھا۔ یہ آواز،،، ایک مخصوص تواتر کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ گوش بر آواز ہونے پر ایسا لگا جیسے کوئی درندہ اپنا شکار اپنے آہنی جبڑوں تلے دبا کر کچ کچاتے ہوئے چبارہ ہو۔

غالبا یہی وہ آواز تھی جس محسوس کرتے ہوئے کرنل شاہان صاحب اپنا نام روشن کرنے کی نیت سے آگے بڑھا تھا۔ اس کی خواہش یقیناً اس طرح ہوگی کہ وہ اس مصروف اور پراسرار ان دیکھے آدم خور کو تن تنہا خود ہلاک کرے۔ مگر یہ خواہش اسے مہنگی پڑتی کیونکہ اسی لمحے۔۔۔۔۔

اچانک گوشت چبانے کی آتی ہوئی متواتر آواز،، یک دم رک گئی۔ اور ایک ہلکی سی غراہٹ ابھری تھی میری ٹھٹکی ہوئی نظریں ڈھینگوں پر جمی ہوئی تھی میں اس کش وپنج میں مبتلا تھا کہ آگے بڑھوں یا راستہ بدلنے کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے پیش قدمی کروں۔

اچانک،،، گولی چلنے کی کان پھاڑ آواز سنائی دی میں ٹھٹک کر ذار جھک گیا۔

میرے عقب میں زاہد اور حیدر تھے۔ جو زمین پر لیٹ گے تھے۔ تاہم انہوں نے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنی رائفلیں ضرور تان رکھی تھیں۔ اور انہیں ایک دم ریڈی حالت میں کر دیا تھا۔ یہ کرنل شاہان کی پانچ سو بور کا بھاری کم فائر تھا جس کی گولی ایک اچھے خاصے ہاتھی کی کھوپڑی چٹخا دینے کے لئے کافی تھی۔ فائر کے گونج دار دھماکے سے پورا جنگل چھوٹے موٹے چرند پرند کی شور آمیز چہکار سے گونج اٹھا تھا۔

مگر،، فائر کے اگلے ہی لمحے، میرے کانوں سے ایک دھاڑ کی آواز ٹکرائی،، اس دھاڑ میں مجھے کسی قسم کی کربنا کی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا تھا ایک ہولناک تصور سے میں کانپ رہا تھا۔

کیا..... کرنل کا نشانہ خطا ہو گیا تھا نشانہ خطا جانے کا مطلب شکاری کی واضح موت تھا۔ اس مخدوش صورتحال کے زیر اثر اچانک میں نے اپنے اندر ایک انوکھا جذبہ محسوس کیا۔۔ ویسا ہی جذبہ جیسا کچھ عرصہ پہلے،، اندسیکرٹری شاہد صاحب کو،،، آدم خور کے چنگل سے بچاتے ہوئے

محسوس کیا تھا بس پھر کیا تھا۔میں نے رائفل تانی اور،،اندھا دھند ڈھینگروں کی طرف بڑھا۔اسی لمحے پھر دماکا سنائی دیا اور اس کے ساتھ ایک ہولنا کا انسانی چیخ سے میں خود ڈھل کر رہ گیا،،یہ چیخ کرنل کی تھی!

☆......☆......☆

اگلے ہی لمحے کچھ ایسی ی غراہٹ آمیز اور انسانی کراہوں کی ملی جلی چیخیں سنائی دینے لگیں۔جیسے کوئی درندہ اور انسان آپس میں گھتم گتھا ہوں،میں نے چھلانگ لگا کر ڈھینگروں کو پار کیا تو سامنے،،نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگے۔

ایک لمبا چوڑا گلدار تے جو کرنل کے ساتھ گھتم گتھا تھا اور اسے پھاڑ کھانے کے چکر میں تھا۔کرنل مقدرور بھر خود کو اس کے خوفناک دانت،، تیز نوکیلے پنجوں سے بچانے کی جان توڑ کوشش میں مصروف تھا۔اس کوشش میں۔۔ان کا لباس،،جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور پھٹے ہوئے گو شوں سے خون کے سرخ سرخ دھبے بھی واضح نظر آرہے تھے میں بھی جانتا تھا۔کرنل،زیادہ دیر تک اس آدم خور اور غیر معمولی طاقتور اور لیحم شحیم گلدار کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔اور جلد ہی اس کی خونخواری کا شکار ہو جائیں گے۔لیکن یہ صورت تحال ایسی تھی کہ پائے رفتن نہ جائے ماندن،، والی بات صادق آتی تھی مگر اس طرح تماشا بھی تو نہ رہا جا سکتا تھا۔ایسے میں اچانک میری چشم تصور میں کرنل کی خوش اور دلکش بیوی کا چہرہ رقصاں ہوگیا اور جو بنگلے مین بیٹی سویٹر بن رہی ہوگی تب پھر اچانک میں نے اللہ جل شانہ کا نام لے کر گلدار کی توجہ ہٹانے کے لیے پہلے ایک ہوائی فائر کیا۔میری خوش کن آمیز توقع کے عین مطابق گلدار نے فوراً میری طرف خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھا اور بڑے خوفناک انداز میں غریا،۔مگر اس نے ابھی تک اپنے اگلے دونوں پنجوں میں کرنل کو دبوچ رکھا تھا۔کرنل کے حلق سے اب گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہو رہی تھی۔اس لمحے جب گلدار مجھ پر حملہ کرنے نہ کرنے کی کوش میں مبتلا تھا تو ایسے میں،میں نے اس کی پیٹھ کا نشانہ لے کر لبلبی دبادی۔گلدار کی پشت والا حصہ ایسی حالت میں تھا اگر خدانخواستہ میرا نشانہ خطا بھی چلا جاتا تو گولی کرنل کے جسم میں پیوست ہونے کی بجائے زمین میں دھنس جاتی اگرچہ میرے محتاط اندزے کے مطابق نشانہ خطا جانے کا امکان کم ہی تھا میرا اور اس گلدار آدم خور کا درمیانی فاصلہ صرف پندرہ سولہ گز تھا،بہر طور میری ایکسپریس رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔گولی خاطر خواہ نشانے پر لگی۔گولی کھا کر گلدار تیز غراہٹ کے ساتھ اچھلا تھا۔ اس اثناء مین کرنل نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگائی اور گلدار کے حلقہ گرفت سے کافی دور نکل گیا۔

گلدار زخمی حالت میں جیسے ہی زمین پر آیا۔میں نے دوبارہ اس کی پیشانی کا نشانہ لے فائر کر دی نشانہ محض اس حد تک خطا ہو گیا کہ اس کی پیشانی پر گولی لگنے کے بجائے اگلی دونوں ٹانگوں کے درمیان جا لگی اور اس بار وہ کوئی آواز نکالے لبغیر ڈھیر ہو گیا۔

مبارک ہو ندیم عباس صاحب بڑا اپالا مارا ہے،میرے عقب سے حیدر اور زاہد نے کھلکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر میں فوراً کرنل کی طرف بڑھا۔وہ اٹھ کھڑے ہوگے تھے بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے بال بال موت کے پنجے سے بچے کہ انہیں معمولی زخم آئے تھے میں ن ے ان کی صورت پر عجیب سی مایوسی کی جھلک دیکھی۔کیسے ہیں کرنل صاحب زیادہ گھائل تو نہیں ہوئے۔میں نے قریب پہنچ کر زراہ ہمدردی پوچھا تو وہ چہرے پر ممنونیت کے آثار طاری کرتے ہوئے بولے تمہارا بہت بہت شکریہ،،اگر تم

نہیں آتے تو آج اس گلدار نے میرا کام تمام کر دیا ہوتا

زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے سر۔اوپر والا ہی کسی انسان کو دوسرے کے لئے نجات کا وسیلہ بناتا ہے۔میں نے کسرِ نفی سے کہا۔تاہم میں نے محسوس کیا ان کے چہرے پر کسی تکلیف کے آثار کی بجائے عجیب سی خاموش کھنڈی ہوئی ہے۔

میرا رواں رواں خوشی سے جھوم رہا تھا کہ مین نے اتنے بڑے آدم خور کا بالا آخر خاتمہ کرڈالا تھا جس نے پر اسرار بن کر پورے علاقے میں ایک عرصے سے دہشت مچا رکھی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ زاہد اور حیدر کی طرح کرنل نے مجھے اب تک میرے ہاتھوں آدم خور کے ہلاک ہونے کی مبارکباد نہیں دی تھی۔کیا وہ اتنا ہی تنگ نظر تھا اور جلن ہو رہی تھی کہ یہ آدم خور اس کے ہاتھوں کی بجائے میرے ہاتھوں انجام کو پہنچا ،میں نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے کرنل نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ویری بیڈ۔آدم خور نکل گیا۔

کرنل کی بات سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔زاہد اور حیدر نے بھی کرنل کی بات سمجھ کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔پھر زاہد سے نہ رہا گیا اور وہ گلدار کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

کرنل صاحب۔آدم خور کو تو اپنے ندیم عباس صاحب نے ختم کرڈالا۔آپ اب کس آدم خور کی بات کر رہے ہیں؟

اس کی بات سن کر کرنل کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ پھیل گئی اصل آدم خور نکل بھاگا ہے۔کرنل نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔میں نے سب پہلے اس پر ہی گولی چلائی تھی مگر اسے پہلے جانے یہ کم بخت گلدار کدھر سے آن ٹپکا مگر کرنل صاحب۔اس کا ثبوت کیا ہے کہ اصل آدم خور وہی تھا۔جو آپ کی پہلی گولی کا نشانہ بنے بغیر بھاگ نکلا اور یہ گلدار۔میں نے سوالیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔حقیقت یہ تھی کہ کرنل کی بات نے مجھے مایوس کر دالا تھا

آؤ میرے ساتھ تمہیں اس کا ثبوت دیتا ہوں ندیم عباس صاحب۔کرنل نے پر اعتماد لہجے میں کہا اور پھر اپن زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چند قدم بڑھ کر تاڑ کے جھنڈ کے پاس پہنچا تو ایک دم میں دھل کر رہ گیا سامنے جھاڑیوں میں کسی بدنصیب انسان کی آدھ کھائی لاش کی جھلک نظر آئی میں ناک پر رومال رکھ کر آگے بڑھا۔پھر جھک کر آدم خور پیروں کے نشانات کے ساتھ چند قدم آگے بڑھا اور پھر ایک طویل گہری سانس لے کر رہ گیا۔کرنل نے غلط نہیں کہا تھا بہر طور ہم نے کرنل ہیریس کی زخمی حالت کے پیش نظر آدم خور کا تعاقب ملتوی کر دیا اور واپس بنگلے میں آ گئے کرنل اب روبہ صحت تھے انہوں نے میرے استفسار پر بتایا تھا کہ وہ اس پر اسرار آدم خور کی جھلک دیکھ چکے تھے۔وہ ایک انتہائی خوفناک سیاہ رنگ کا شیر تھا۔

جس کی چمکدار آنکھوں میں بلا کی درندگی اور چکنے جسم میں عجیب پر سراریت میں محسوس ہوتی تھی۔پتہ نہیں کیوں میرا دل تب بھی اس پر اسرار دہشت ناک آدم خور کو دیکھے بغیر مان نہیں رہا تھا۔یہ دو دن بعد کا ذکر تھا۔

موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی مگر اس کا زور جلد ہی ٹوٹ گیا۔ہر دوڑ اور چکروتہ کے جنگل دھل کر نکھر گئے تھے۔سرخ اور منقش کلغیوں

والے جنگلی مرغوں کی ککڑکوں کی آواز سے جنگل میں خوش الہانی سی بکھری ہوئی تھی اس دن ہم نے آدم خور کی سرکوبی کے لے اپنی مہم کاارادہ ترک کرڈالا اور بنگلے میں ہی محبوس ہوکررہ گئے۔

رات کے بارہ بجے کاعمل ہوگا۔رات کا کھانا اکٹھے کھانے کے بعد گھنٹہ بھر باتیں کرنے اور چائے پیتے رہنے کے بعد کرنل اپنا پائپ سلگاتے ہوئے گڈ نائٹ کہہ کر اپنی بیگم کے ساتھ بیڈروم میں چلے گئے۔پھر زاہد اور حیدر بھی جمائیاں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ناچار میں بھی اپنے کمرے میں آ کر سنگل بیڈ کے بستر پہ دراز ہوگیا۔کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔نیند میری آنکھوں سے ابھی کوسوں دور تھی۔میں بیڈ پر اپنے دونوں ہاتھوں کا سرہانہ بنائے۔۔نیم دارتھا۔میری نظروں کے عین سامنے۔کھڑکی تھی۔جو باہر جنگلمیں کھلتی تھی۔اس پر باہر سے آہنی گرل اور اندر شیشے لگے ہوئے تھے یہ علاقہ بارانی تھا۔ہر سے آسمان پربادل چھائے رہتے تھے۔حتی کہ چودھویں کا پورا چاند بھی بدلیوں کے پیچھے ایک ذرا سی روشنی کی جھلک دکھا کر دوبارہ چھپ جاتا۔

میں آج والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔وہ پراسرار آدم خور ہمارے ہاتھوں صاف بچ نکلا تھا مزید برآں کرنل بھی ایک خطرناک درندے گلدار کے خونی پنجوں سے بال بال بچا تھا۔تاہم ہماری یہ کامیابی کیا کم تھی کہ اب وہ پراسرار آدم خورخود ہماری نظروں میں غلطاں تھا کہ اچانک میں نے غیرارادی طور پر کھڑکی باہرتاریکی میں ایک سایہ دیکھا۔یہ کسی انسان کا سایہ تھا۔میں چونک کراٹھا۔،کھڑکی تک آیا۔دھڑ کتے دل کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ کھولا۔ذرا باہر سر نکالا۔مرطوب ہوا کا ٹھنڈا دینے والا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تھا۔نجانے کیوں مجھے جھرجھری سی آگئی۔

یہ سایہ اب بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔اس کے خدوخال کچھ واضح ہونے لگے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت پورا چاند بادل کے ایک ٹکڑے سے جھانکا تھا۔میں اس پہنچان کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔وہ پراسرار اور مجہول سا جھکی شکاری تھا۔سر داڑھی کے بال کھچڑی سے۔،،پرانا خاکی نیکر اور اسی رنگ کی قمیض پہنے،،گھنی سفیدی بندوق تھی۔وہ اب بنگلے کے بیرونی دروازے پر کھڑا دستک دینے کے لئے پر تول رہا تھا۔۔میرے جی میں جانے کیا آئی کہ میں جلدی سے اپنے کمرے سے نکلا بیرونی دروازہ کھولنے کے لئے لپکا۔۔تاکہ اس جھکی بڈھے شکاری کو نہ صرف قریب سے دیکوں۔،، بلکہ اس کے آنے کا مقصد بھی دریافت کروں۔یہ سوچ کر میں نے جلدی سے بے آواز انداز میں دروازہ کھول دیا۔

اگلے ہی لمحے سامنے نظر پڑتے ہی میں نے اپنی جگہ سن ہوکررہ گیا۔ایک عجیب سے خوف کی لہر میرے پورے وجود میں سرایت کرگئی کافی دیر تک سامنے اندھیروں میں آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔وہاں کوئی بھی نہیں تھا مجھے اب شاید حیرت کا سامنا تھا۔کدھر گیا یہ میں نے حیرت سے زیرلب خودکلامی کی۔مجھے کمرے سے بیرونی دروازے تک آنے میں مشکل سے دس سیکنڈ بھی نہیں لگے ہوں گے۔

اتنے کم وقفے میں یہ بوڑھے جھکی کدھر چلا گیا تھا۔اس واقعہ نے میری رگ تجسس کو اور مہمیز کا اور میں اسے تلاش کرنے کا پکا تہیہ کرکے باہر نکلا۔اگلے آٹھ دس سیکنڈ میں،، بنگلے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹارچ اور اپنی ایکسپریس رائفل اٹھالی تھی۔باہر نکل کر میں نے نے دائیں

بائیں تاریکی میں ٹارچ روشن کرکے اس کے دائرے کو چاروں طرف حرکت دی۔۔۔دور نزدیک،،مگر سوائے گھنے چھتنار درختوں اور،،قد آدم خورروجھاڑیوں کے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔۔۔البتہ ان جھاڑیوں میں چھوٹے موٹے ڈرے سہمے جانوروں کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی ہوئی ضرور دکھائی دی تھیں میں نے بے اختیار نیچے دیکھا تو جیسے میری دل مراد بر آئی۔

زمین اس پراسرار شکاری کے بڑے بڑے جوتوں کے نشانات موجود تھے۔اب میرے وہم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کو اس جھکی شکاری کے اچانک نظر آ کر غائب ہونے پر تھوڑی دیر پہلے میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔اس کا مطلب تھا پراسرار شکاری تھوڑی پہلے ادھر موجود تھا اور بیرونی دروازے تک بھی آیا تھا مگر پھر اچانک ہی کہیں غائب ہوگیا تھا وہ ایک دم کہاں غائب ہوگیا تھا؟یہ وہ پراسرار سوال تھا جو میرے اندر کی ہیبت ناک کو اہی نہیں بلکہ میرے فطری تجسس کو بھی بڑھانے کا باعث بن رہا تھا بہرطور۔میں نے قدموں کے نشانات کے ذریعے اس کا شکاری کا تعاقب کرنے کے ارادے آگے قدم بڑھا دیے

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔پورا جنگل جیسے بھیدوں بھری خاموشی میں غرق تھارات کے اس آخری پہر میں،میرا یوں ایک پراسرار شخص کا تعاقب کرنا یقیناً خطرے سے خالی نہ تھا۔یہ جنگل ہر قسم کے درندوں سے بھرا ہوا تھا۔یہی نہیں یہاں تک کہ زہریلے سانپوں کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے موٹے کیڑوں،،جن میں مکڑی اور گولا پتھ نسل کے حشرات الارض بھی کم خطرناک نہ تھے،،اگرچہ میں نے پیروں میں لانگ بوٹ چڑھا رکھے تھے لیکن پھر بھی مجھے ان سب کا خطرہ تھا۔مگر میں بھی ہٹ کا پکا تھا اس پراسرار شکاری کا سراغ لگانا چاہتا تھا لہذا قدموں کے نشانات پر ٹارچ کی روشنی کے ذریعے آگے بڑھنے لگا

اس وقت مجھے شاید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں نے دیکھا کہ پیروں کے نشانات بنگلے کے چاروں طرف دو چکر مکمل کرنے کرنے کے بعد اندر تاریک جنگل کی طرف ہو لئے تھے جس کا مطلب تھا اس پراسرار شکاری نے بنگلے کے گرد دو مرتبہ طواف کیا تھا۔اور پھر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

میں دل مضبوط مجھے شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں نے دیکھا کہ پیروں کے نشانات بنگلے کے چاروں طرف دو چکر مکمل کرنے کے بعد اندر تاریک جنگل کی طرف ہو لے تھے جس کا مطلب تھا اس پراسرار شکاری نے بنگلے کے گرد دو مرتبہ طواف کیا تھا اور پھر خاموشی سے چلا گیا تھا۔

میں دل مضبوط کے ہیبت ناک گھنے تاریک جنگل میں داخل ہو چکا تھا۔کافی دور چلتے رہنے کے بعد اچانک مجھے سامنے مدھم روشنی میں اس بوڑھے شکاری کی پر سرار آماجگاہ دکھائی دی جو برگد کے دو تین گھنے اور موٹے تنوں کے قدرتی ملاپ سے بنے خاصے وسیع جھنڈ پر مچان نما جھونپڑی بنی ہوئی تھی آسمان پر اب آوارہ بادلوں کے ٹکڑے دھیرے دھیرے سرکنے لگے تھے اور آسمان قدرے صاف اور روشن نظر آنے لگا تھا۔پوران ماشی کے پورے چاند کی روشنی جنگل کے چھتنار پیڑوں سے چھن کر برسات کی طرح اس جھونپڑی پر پڑ رہی تھی میں قریب پہنچ کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک کر کھڑا ہوگیا اور سامنے نظریں جما دیں۔سرکنڈوں کی یہ عجیب وضع کی جھونپڑی ویران تھی۔صراف

ایک شاخوں سے بنائی ہوئی رسی کی سیڑھیاں نیچے جھول رہی تھیں۔

اچانک میں نے کہیں قریب ہی ایک غراہٹ سنی ۔میرا دل یکبارگی زور سے دھڑ کا کہ میری نظر لگ بھگ چھوفٹ ۔کے ایک سیاہ شیر پر پڑی ،وہ ڈھائی فٹ کے قریب چوڑا تھااور اس کا سارا جسم کو ے کی طرح سیاہ تھا۔یہ چیتے اور شیر کی بچ کی نسل کا بڑا خطر ناک اور خوفنا ک درندہ تھااس کی آنکھوں میں غضب نا ک چمک تھی اس کا رخ جھونپڑی کی طرف تھا۔

وہ،،درندہ میری طرف متوجہ نہ تھا۔لیکن اس کی ہیبت نا ک اوس قدر مجھ پر طاری ہونے لگی کہ میری پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں اور پورے وجود میں سنسنی آمیز لرزش سی طاری ہوگئی تھی۔تاہم اس درندے کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھالا تھا۔وہ پر اسرار آدم خور کالا شیر تھا۔جس نے آس پاس کی آبادی میں دہشت مچارکھی تھی اور نجانے کتنے ہی معصوم انسانوں کو اپنی بھوک کی بھنٹ چڑھا چکا تھا۔میں اسے کبھی دیکھ تو نہ سکا البتہ آج کرنل نے اسے دیکھا تھا اور مجھے آگاہ کیا تھا ممکن ہے اپنی نسل کے ابھی شیر یہاں موجود ہوں۔

بہر طور،،اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ وہی آدم خور شیر ہی تھا یا کوئی دوسرا عام درندہ تھا میں نے دیکھا وہ جھونپڑی میں موجود،،یہ شیر اس بوڑھے شکاری کو نہ ہڑپ کر جائے اگر چہ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ وہ شکاری اوپر موجود بھی تھا یا نہیں پھر ٹھیک اسی وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کالے شیر نے ایک جست بھری اور جنگلی بلی کی طرح اوپر چڑھ گیا۔میں دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ خدا کرے وہ شکاری اوپر جھونپڑی میں موجود نہ ہو ورنہ آدم خور کا آسانی سے شکار ہو سکتا تھا لیکن ادھر اب میرے دل میں بھی جوش کی تمتماہٹ ابھرنے لگی اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،،اپنی ایکسپریس رائفل سنبھالی اور درخت کی اوٹ سے نکل کر جھونپڑی کی طرف دوڑا،،میں نے سر اٹھا کر دیکھا،،وہ کالا شیر اب جھونپڑی کے آدم خور شیر سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔مگر میں ناامید نہ تھا اور نہ ہی جان کے معاملے میں نے کالے شیر کو بھٹکانے کی خاطر ایکسپریس کے ہوامیں دوز ددار فائر کرڈالے۔

رات کے پہر سناٹے میں پورے جنگل کی گہری پر سکوت چادر پر جیسے خنجر چل گیا۔

مگر دوسرے ہی لمحے میرے سر پر حرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر اچانک جھونپڑی کے اندر سے وہ بوڑھا مجہول شکاری نکلا تھا اور خاصے غصے کے سا انداز میں اطراف میں نظر دوڑا رہا تھا۔اس کی حرکات وسکنات سے کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے آرام میں خلل پڑا ہو،میں اچنبھے کی سی حالت میں اس کی طرف تکے جا رہا تھا اور ورطہ حیرت میں مبتلا تھا۔کہ یہ بوڑھا تو اتنے آرام سے کھڑا نظر آ رہا ہے جیسے اس معلوم نہیں ہو کہ اس جھونپڑے کے اندر ایک خطرے نا ک آدم خور آ گیا تھا اثنائے راہ اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔وہ برہمی کے انداز میں اوپر سے ہی چلایا:

اے کون ہو تم۔یہ فائرنگ کیوں کی تھی تم نے؟اس کے ہاتھ میں سکے والی قدیم ساختہ بندوق بھی نظر آ رہی تھی

مجھے اس کے لہجے پر غصہ آیا مگر قدرے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا،میں نے ابھی ابھی ایک کالا شیر تمہاری جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔یہ وہی آدم خور ہے جس نے اب تک تین سو سے زیادہ معصوم انسانوں کو ہڑپ کر لیا ہے

میری بات سن کر وہ قدرے ٹھٹکا پھر عجیب بے ہنگم انداز میں قہقہ بلند کیا اور قدرے مذاق اڑانے والے انداز میں چلا کر بولا

تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں زندہ سلامت تمہارے سامنے کھڑا ہوں

نہیں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے تمہاری جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے پر یقین لہجے میں کہا

اچھا اچھا،، میں ابھی اندر دیکھ لیتا ہوں، ویسے تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ برآمد ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں اور میں سخت شش و پنج اور حیرت میں مبتلا تھا کہ آخر وہ آدم خور خطر ناک شیر کدھر چلا گیا

یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے تم جاؤ۔ ویسے تمہارا ایک بار پھر شکریہ اس بوڑھے نے اس بگویا جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا اور دوبارہ اندر چلا گیا میں چند لمحے تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہنے کے بعد واپس بنگلے کی طرف ہولیا۔

یہ کیسا معمہ تھا۔ اپنے بنگلے میں پہنچ کر جب میں بیڈ پر دراز ہوا تو میرا پورا وجود مجسم سوالیہ نشان تھا۔

میں کیسے اس بات کو جھٹلا سکتا تھا، جبکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو جھونپڑی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہیں یہ بوڑھا جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔

ایکا یکی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کیطرح کوندا مگر اس بوڑھے شکاری کو جھوٹ درندہ،، جھونپڑی کے اندر جا کر اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا اس میں یقن سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آدم خور اس جھلی بوڑھے کا پالتو ہوگا۔ اگلے دن ناشتے کی میز پر میں نے جب اپنے تینوں ساتھی دوستوں کرنل شاہان صاحب، زاہد اور حیدر کو شب گزشتہ سے متعلق اپنی پر اسرار مہم کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا تو کرنل شاہان صاحب بری طرح چونکے تھے جبکہ میری کہانی پر زاہد نے فوراً اپنی رائے کا ظہار کیا تھا۔

میرا بھی یہی خیال ہے، ہو نہ ہو،، اس آدم خور درندے کا اس بوڑھے سے ضرور کوئی تعلق ہے۔ سری واستو نے بھی زاہد اور حیدر کی بات سے اتفاق کیا مگر کرنل کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس لغویات پر بالکل یقین نہ ہو حقیقت بھی یہی نظر آ رہی تھی ایک درندہ اور وہ بھی جسے انسانی خون کی عادت پڑ چکی ہو۔ بھلا کہاں ایک انسان کا دوست یا پالتو ہو سکتا ہے۔ کرنل نے اگلے ہی لمحے فوراً زاہد اور حیدر کی مضحکہ خیز باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ نو،، نیور۔ خواہ مخواہ سیدھے سادھے واقعے کو پر اسرار بنانے کی ضرورت نہیں ہے رات کے وقت ایسے ماحول میں ندیم عباس کو ضرور وہم ہوا ہے۔

نہیں کرنل شاہان صاحب...... میں نے فوراً کرنل کی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا مجھے اس واقعے کا بالکل اس طرح ہی یقین ہے جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا یقین،، میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس آدم خور کو اس بوڑھے کی جھونپڑی کی طرف زقند بھرتے اور اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے میری پر یقین گفتگو پر لمحہ بھر کو سب کے چہروں پر خاموشی چھا گی۔ اور پرھ دوبارہ اس موضوع پر گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کرنل زاہد اور حیدر اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے ناشتے کے بعد ہم نے پھر جنگل کا قصد کیا۔ اس بار ہم نے اپنی

اس شکاری مہم کو حتمی نتیجے پر پہنچانا تھا اس لے کیمپنگ کا سامان بھی ہم نے لے لیا تھا۔ دو ملازم جن میں ایک مانا بھی تھا، کے ہمراہ جانب مہم ہوئے۔

ہم نے سب سے پہلے اس آدم خور کے تعاقب میں بوڑھے شکاری کے برگدوالی جھونپڑی اور آس پاس کے علاقے کی طرف رخ کیا، اس بار جانے کیوں ہمارے چہروں پر غیر معمولیخاموشی اور سناٹا کی کیفیات طاری تھیں۔ دل میں نجانے نے کسی بے چینی نے گھر کیا ہوا تھا ایک نامعلوم سا خوف دل و دماگ میں کچھ اس طور طاری تھا جیسے آج کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا تھا یہ شاید اس لیے تھا کہ ہم آج اپی مہم کو اخری شکل دینے کا تہیہ کر رکھا تھا جب تک اس آدم خور کو نابود نہ کر ڈالیں۔ واپس نہیں لوٹیں گے یہ حقیقت بھی تھی کہ صرف بنگلے کے آرام دہ بیڈ رومز میں پڑے سگار دلوں میں انجانے خدشات تلے موہوم سا خوف لئے عازم مہی ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا ماہ اپریل کی دھوپ چھتنار اور چھارے درختوں سے کرنوں کی صورت جھاڑیوں اور جنگلی پودوں پر روشنی بکھیر رہی تھی ہمارا رخ برگدوالی جھونپڑی کی طرف تھا، آج ہمارا ارادہ اس پر اسرار شکاری سے تفصیلی بات کرنے کا تھا جس کا ذمہ ظاہر ہے مجھے ہی سونپا گیا تھا۔

ہم جھونپڑے کے قریب پہنچ کر اوپر تکنے لگے۔ وہاں آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا۔ کہ اوپر جھونپڑی میں وہ بوڑھا موجود بھی تھا یا نہیں بالا آخر اسے پکارنے کا فریضہ مانا نے سر انجام دیا اور آگے چند قدم بڑھا کر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بناتے اس نے آواز لگائی۔

لالہ جی دو تین بار پکارنے کے باوجود جھونپڑی میں سناٹا طاری رہا تو ہم یہی سمجھے کہ وہاں کوئی نہیں، لہذا ہم کام واپس پلٹ کر آگے ہو لئے۔ ابھی ہم بہ مشکل چند فرلاگ ہی چلے ہوں گے کہ اچانک ہمارے عقب سے غراہٹ سی ابھری۔ ہمارے قدم گڑ کے رہ گے اور دل کنپٹیوں میں دھڑ کے لگا۔ ہمارے چلنے سے سرسراہٹ ابھر رہی تھی وہ یکلخت دم توڑ چکی تھی لیکن عقبی سمت میں ابھی تک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دبے پاؤں خشک پتوں پر چلتا ہوا ہمارے تعاقب میں آ رہا ہو۔ یہ وہی راستہ تھا جو اس بوڑھے کی برگدوالی جھونپڑی کی طرف جاتا تھا ہم چاروں ٹھٹک کر رک چکے تھے۔ پھر فوراً ہی ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہم نے اپنی اپنی رائفلوں کے سیفٹی کیچ چڑھائے اور انہیں ایک دم ریڈی پوزیشن میں لے آئے،۔ ابھی ہمیں ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک قریب ہی جھاڑیوں سے آدم خور سیاہ شیر نمودار ہوا۔

ایک لمحے کو تو ہم اس کی دہشت سے بت بنے رہ گے مگر دوسرے ہی لمحے کرنل اور میں نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے رائفل والا ہاتھ بلند کیا۔ اسی لمحے سیاہ آدم خور نے زاہد پر جھپٹنے کے لئے چھلانگ لگائی اور ٹھیک اسی وقت میری اور کرنل کی شکاری رائفلوں نے دو شعلے اگلے۔ فضا میں دو دھماکے ہوئے۔ مگر ہمیں آدم خور کی دھاڑ کی بجائے ایک لرزہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ زاہد کی چیخ تھی۔ جس کا مطلب تھا ہمارے نشانے خطا گئے تھے مگر آدم خور کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

اس نے زاہد کا نرخرہ اپنے دانتوں تلے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ حیدر اپنی جگہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ باقی دو ملازم درندے کی دہشت سے زمین پر بیٹھ گے تھے جبکہ ادھر میں نے اور کرنل نے آن واحد میں اپنی رائفلیں ایک بار پھر سیدھی کیں، اسی دوران وہ آدم خور غراتا ہوا میری طرف پلٹا،، اس نے

مجھ پر جست لگائی۔

میں نے اس کا نشانہ لے کر بلبلی دبا دی۔ گولی اس آدم خور کے کہیں لگی تھی۔ جس کا ثبوت اس کے جست بھرنے کے دوران ہی فضا میں سنائی دینے والی خوفناک دھاڑ تھی۔ میں بھی فائر کرتے ہی خود شیر کے خونی جبڑوں سے بچانے کیلئے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

آدم خور اپنی ہی جھونک میں دل ہلا دینے والی دھاڑ مارتا ہو میرے سر کے اوپر سے گزرتا چلا گیا اور پھر دوبارہ نمودار نہ ہوا میں عالم جوش میں اٹھا، کرنل اور حیدر گھاس پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے زاہد کو سنبھالنے کیلیے لپکے میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آدم خور کے تعاقب میں چلا میرا رخ ان قدم آدم گھنی جھاڑیوں کی طرف تھا جدھر وہ آدم خور غائب ہوا تھا۔

میرے پیچھے بے چارے زاہد کا کیا حشر اہوا اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے کرنل اور حیدر کافی تھے میں دکھ کے احساس کو دباتے ہوئے ایک جوش کیسی کیفیت لیئے بجلی کی سرعت کے ساتھ آدم خور کے پیچھے بھاگا تھا اور آج کسی بھی صورت میں اس موذی کا قلع قمع کرنے کا میں اپنے دل میں پکا عزم کر چکا تھا۔ لہٰذا میرے قدم کشاں کشاں اس آدم خور کے نشانات پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ گھاس اور جنگلی پودوں پر تازہ گاڑھے خون کے نشانات بھی کہیں کہیں مجھے نظر آتے رہے تھے۔

جانے کیوں مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اس آدم خور نے برگد والی جھونپڑی کی طرف رخ کیا ہوگا۔ مجھے ایسا لگتا تھا اس پراسرار بوڑھے شکاری کا تعلق اس کالے شیر سے تھا۔ وہ مجھے اس کا پالتو جانور ہی محسوس ہوتا تھا مگر اس میں ایک ابہام بھی تھا کہ بھلا ایک ایسا درندہ جسے انسانی خون کی چاٹ لگ چکی ہو وہ بھلا کیونکر انسان کا پالتو جانور ہو سکتا تھا۔

تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے میں یہ سب سوچے جا رہا تھا اور میرے دل کی دھڑکین کنپٹیوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھولی ہوئی سانس اور چہرے پر جوش آمیز تمتماہٹ لے جب میں اس برگد والی جھونپڑی کے قریب پہنچا تو قدرے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس آدم خور شیر کے پیروں اور اس کے زخم سے ٹپکنے والے خون کے قطروں کے نشانات سامنے جھونپڑی والے درخت کی طرف جا کر معدوم ہو رہے تھے۔ ایکا ایکی میرے پورے وجود میں اب جوش کے ساتھ نامعلوم خوف کی سی لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا وہ آدم خور اوپر جھونپڑی کے اندر موجود تھا آج یں نے اس پراسرار کا پردہ چاک کرنے کا پکا تہیہ کر رکھا تھا اسی لئے میں نے خاموشی سے درخت پر چڑھنے کا ارادہ کا ی اور رائفل کو کاندھے پر لٹکا کر ابھی اوپر چڑھنے کے لئے برگدے موٹے تنے کو چھوا ہی تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر میں ٹھٹک کر اپنی جگہ پر جم گیا اور آواز کی سمت سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ آواز اس پراسرار بڑھے شکاری کی تھی جو نجانے کس وقت اچانک جھونپڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

اے کیا چاہتے ہو۔۔تم کیوں اوپر آ رہے ہو

اس کی بات سن کر مجھے اس بوڑھے کی مکاری پر غصہ تو بہت آیا اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ ایک ایسے خطرناک آدم خور کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا جس نے کئی معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔۔ دوسرے اس بار اس آدم خور کی زد میں میرا دوست زاہد بھی آ گیا تھا۔ اب جانے اس بے چارے کا کیا حال تھا۔

میں نے اس مکار بوڑھے کی طرف دیکھا تا کہ اسے سخت جواب سے نوازوں لیکن جیسے ہی میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو بری طرح چونگ گیا ۔ میں نے دیکھاتو بری طرح چونگ گیا میں نے دیکھا اسکا ایک کندھا بری طرح زخمی تھااور وہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا جسے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنادوسرے ہاتھ اس پر رکھا ہوا تھا۔اس کا زخم تازہ تھا۔

اچانک ایک سنسنی خیز تصور سے میں سرتا پا لرز اٹھا تا ہم میں نے جلد اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور درشت لہجے میں اس سے بولا ۔ وہ تمہارا پالتو شیر میرے دوست کو زخمی کر کے یہاں آیا ہے میں اسے ہر قیمت پر ہلاک کروں گا۔تم نیچے اترو میرے ہلکار نے پر اس بوڑھے شکاری کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا اس کے جھریوں زدہ چہرے پر بڑی سنسنی خیز اور جھپٹا نہ جاؤ یہاں سے ۔۔تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھلا ایک آدم خور چیتے کا یہاں کیا کام؟

میں سمجھ گیا کہ یہ بوڑھا میرے ساتھ مکر کر رہا ہے۔میں نے غصے سے دھاڑ کر کہا

بڈھے۔میں اس بار تیرے جھانسے میں نہیں آؤں گا، تجھے اپنی جھونپڑی کی تلاشی دینا ہوگی

اچھا......اچھا......آ جاؤ پھر اوپر......اس بار وہ بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا

مجھے یقین تھا کہ اس کا وہ پالتو آدم خور اوپر ہی موجود ہوگا اس بار میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جھونپڑی کی تلاشی لے کر ہی رہوں گا۔حالانکہ پہلے ہی بوڑھے کی بات پر اعتبار کر کے لوٹ گیا تھا بہرطور میں اوپر چڑھا اور مچان نما تختے پر بوڑھے کے بالمقابل کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں بغور جھانکنے لگا ۔ مجھے جانے کیوں اس کی آنکھوں میں ملگجا سا جالا نظر آیا۔ایک عجیب سی حیوانی چمک ہویدا تھی اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے میں اپنی رائفل تانے جھونپڑی کے اندر گھس گیا اندر سوائے کاٹھ کباڑ کے اور کچھ بھی نہ تھا۔بستر کے طور پر استعمال ہونے والے ایک کونے میں صرف گھاس پھونس دھری تھی۔

مجھے شدید حیرت کا سامنا ہوا،،آخر کہاں گیا آدم خور شیر جبکہ میں نے اسے دوسری بار اپنی آنکھوں سے اس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔میں باہر نکلا تو جھکی بوڑھا پراسرار نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا میں خاموشی سے درخت سے نیچے اتر آیا اور وہاں سے کسی خیال کے تحت اک قریب جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔اب میں یہاں سے با آسانی جونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا بوڑھا مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا آسمان پر اچانک ہی کالے کالے بادل نمودار ہونے لگے تھے۔ ماحول سہ پہر میں بھی ہلکی ہلکی تاریکی میں ڈوبنے لگا میں ابھی تک جھونپڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔آج میں ہر صورت اس پراسرار ڈرامے سے پردہ اٹھانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جانے کیوں ایسا کچھ یقین سا تھا کہ وہی آدم خور سیاہ اپنی آئندہ کسی کاروائی کے لئے دوبارہ اس جھونپڑی کے اندر سے ہی نکلے گا۔

تب پھر اچانک میں بری طرح ٹھٹکا۔میرا دل ایک دم جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔وہ خونی اور پراسرار آدم خور شیر جھونپڑی سے برآمد ہوا تھا۔میں نے دیکھا اس کا کندھا ابھی تک زخمی تھا س ۔ایک لمحے کو جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی رائفل سے اسس خونی آدم خور نشان لیا

اور سانس روک کر لبلبی دبا دی۔ پرسکوت فضا میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ کالا شیر جھونپڑی کے تختے پر کھڑے کھڑے ایک دھاڑ مار کر زور سے فضا میں اچھلا اور نیچے آ رہا۔ میں اب جوش کے مارے جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ آدم خور شیر گھاس پر پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے ذرا قریب آ کر نشانہ لیا اور دوسری گولی بھی اس کے ہولے ہولے سانس لیتے سیاہ وجود میں اتار دی آدم خور شیر ختم ہو چکا۔ میں نے جھونپڑی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہ ابھی وہ پراسرار بوڑھا غصے سے لال پیلا ہو کر باہر نکلے گا مگر ایسا نہ ہوا......میں یہی سمجھا شاید وہ اندر چھپا ہوا ہے میرا سامنا کرنے سے کترا رہا ہو بہرطور میں اپنی فتح پر نازاں واپس ہوا۔ ادھر کرنل شاہان صاحب اور حیدر زخمی زاہد کو اٹھا کر گاؤں کے وید کے پاس علاج کے لئے لے گئے تھے زاہد کی زندگی بچ گئی تھی وہ سب لوگ میرا کارنامہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کرنل اور حیدر میرے ساتھ چل کر اس مردہ آدم خور کو دیکھنے گئے اور پھر ملازموں کے ذریعے کرنل نے اس آدم خور کو گاؤں والوں کے دیدار کے لئے اسے اٹھوا کر گاؤں بھجوا دیا۔۔۔

☆......☆......☆

یار ندیم،، یہ بوڑھا شکاری کدھر گیا؟

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا جب ہم واپسی کے لئے سامان پیک کر رہے تھے تو حیدر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا کہاں جا سکتا ہے وہ بڈھا،، اپنی بر گد والی جھونپڑی میں بیٹھا سوگ منا رہا ہوگا۔ اپنے پالتو جانور کی موت کا مگر،، یار یہی تو حیرانی کی بات ہے کہ اب وہ بوڑھا ادھر نہیں ہے۔ مانا اور دوسرے ملازموں کو میں نے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ اس بوڑھے کو تلاش کریں تا کہ اس کو گرفتار کیا جا سکتا ہے وہ،،،؟ اس بار میرے لہجے میں بھی حیرت تھی۔ تب پھر سر سری وا ستو لمحہ بھر بھیدوں بھری خاموشی کے بعد عجیب سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا، ذاکر،، لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آتا،، مگر شاید تم میری بات کا یقین کر لو۔

ہاں،، ہاں کہو؟

وہ بوڑھا کسی خاص شکتی کا مالک تھا...... مجھ تو یوں لگتا ہے جیسے آدم خور وہ پراسرار بوڑھا ہی تھا۔

حیدر کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا،، اور حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

☆......☆......☆

اگلے شمارے میں آپ محمد خالد شاہان لوہار کی قسط وار کہانی ملاحظہ فرمائیں گے۔

☆......☆......☆

اے کاش کہ مل جائے حکمرانی اک بار
ہم سلطنت میں سے غربت کا جنازہ نکال دیں
ملک شہریار اسلم......سلانوالی، سرگودہا


بے مروت چاہتیں

بے مروت چاہتیں

تحریر: مجید احمد جائی......ملتان

0301-7472712

کون بشر ھے جو خوشیوں بھری زندگی نہیں چاھتا۔؟پیار کرنے والا محبوب نہیں چاھتا۔ھر زندگی کے حسین سپنے ھوتے ھیں۔لیکن جب بھی سپنے پل بھر میں ریزہ ریزہ ھو کر بکھرتے ھیں تو روح تک زخمی ھو جاتی ھے۔دل خون کے آنسو روتا ھے۔اپنے پرائے ھو جاتے ھیں۔دوست دشمن بن جاتے ھیں۔جان دینے والے ،آنکھوں میں حسین سپنے سجانے والے، آنسوؤں کی سوغات دے جاتے ھیں۔خون سے تر بہ تر آنکھیں کیسے زندگی چاھتی ھوں گی۔؟

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

زندگی کیا ہے۔۔؟اللہ تعالیٰ کا خوبصورت عطیہ۔ خوبصورت نعمت،یوں تو خوشی وغمی زندگی کا حصہ ہیں۔زندگی اس وقت اور بھی حسین ہو جاتی ہے جب اپنی جان سے بڑھ کر چاہنے والا مل جائے۔زندگی پھولوں کی طرح کھلکھلا اُٹھتی ہے۔ہر طرف بہار ہی بہار ہوتی ہے۔پرندے گیت گاتے ہیں۔کوئل نغمے سناتی ہے۔دنیا کا ہر ذرہ حسین لگتا ہے۔ہر چیز مبارکیاں دیتی محسوس ہوتی ہے۔مگر۔۔۔۔مگر۔۔یہی زندگی اس وقت،ویران،عذاب مسلسل لگتی ہے جب جان سے زیادہ عزیز،جان لینے پر تُل جائیں۔عزت کے رکھوالے،عزت نیلام کرنے لگیں،زندگی ویران،سنسان کھنڈرات سی ہو جاتی ہے۔بے رونق سی زندگی،اجڑی سی زندگی،لحہ لحہ عذاب مسلسل،آنسوؤں میں نہاتی زندگی بے جان سی ہو جاتی ہے۔

سیانے سچ ہی تو کہتے ہیں اگر زندگی میں دکھ،درد،غم والم،آہیں،سسکیاں،آنسو نہ ہوتے تو یہ کبھی فنا نہ ہوتی۔زندگی کو موت نہ آتی۔یہ کبھی نہ مرتی،یہ کبھی نہ مُرجھاتی۔

کون بشر ہے جو خوشیوں بھری زندگی نہیں چاہتا۔؟پیار کرنے والا محبوب نہیں چاہتا۔ہر زندگی کے حسین سپنے ہوتے ہیں۔لیکن جب بھی سپنے پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہیں تو روح تک زخمی ہو جاتی ہے۔دل خون کے آنسو روتا ہے۔اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔دوست دشمن بن جاتے ہیں۔جان دینے والے،آنکھوں میں حسین سپنے سجانے والے،آنسوؤں کی سوغات دے جاتے ہیں۔خون سے تر بہ تر آنکھیں کیسے زندگی چاہتی ہوں گی۔۔؟

آنسو دینے والا خود تو کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔لیکن جس کے سپنے ٹوٹے ہوں۔جن کے یار بچھڑے ہوں،اپنے پرائے ہوئے

ہوں۔وہ کیسے چین کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ان کی تو نیندیں روٹھ جاتیں ہیں۔آنکھیں چھم چھم برستی ہیں۔

جب پیار کرنے والے بیچ راہوں کے کانٹوں کے حوالے کرکے خود پھولوں کی سیج پر سو جاتے ہیں۔تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔روح زخمی ہو جاتی ہے۔انگ انگ سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔زبان، بے زبان ہو جاتی ہے۔ہونٹوں پہ قفل لگ جاتے ہیں۔آنکھیں سنسان بنجر وادی کی طرح ہو جاتیں ہیں۔آنسو،آہیں، سسکیاں مقدر بن جاتے ہیں۔ہزاروں سپنے آنکھوں میں سجا کر، حسین خواب دکھا کر جب پل بھر میں چکنا چور کر کیے جاتے ہیں تو موت سے پہلے موت آجاتی ہے۔قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیان کرنے والے پل بھر میں سبھی وعدے،قسمیں توڑ کر روح زخمی زخمی کرکے بدل جاتے ہیں۔جس کی خاطر اپنوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔جن کی خاطر زمانے بھر سے دشمنی مول لی جاتی ہے۔جب وہی پیار کے خوبصورت حسین محل کو گرا کر، تباہ و برباد رقیب کی بانہوں میں جا جھولتے ہیں۔کیا منظر ہوتا ہوگا۔۔؟آسمان بھی روتا ہوگا۔۔؟چاند بے بسی،اداسی کا لبادہ اوڑھ کر خاموش تماشائی بنتا ہوگا۔۔۔۔یہ تو ان سے پوچھئے جن کے یار بچھڑے ہیں۔جن کے اپنے پرائے ہوتے ہیں۔جن کی زندگی بے رونق سی ہو جاتی ہے۔در،در کی ٹھوکریں مقدر بن جاتیں ہیں۔وہ پیار کے پوجاری، پیار کا کیسے ماتم کرتے ہوں گے۔؟اپنوں کے غم کیسے بھلاتے ہوں گے۔؟اپنے زخموں پہ کیسے مرہم رکھتے ہوں گے۔؟آنسو جو تیزاب بن کر دل کو جھلساتے ہوں گے۔۔۔پل پل مرتے ہوں گے۔ان کی زندگی،موت کی آغوش میں چلی جاتی ہوگی۔جب اعتبار کے بندھن ٹوٹے ہیں تو زندگی سسکتی،تڑپتی ہے۔دل خون کے آنسو روتا ہے۔بلکل اسی طرح جس طرح لمبی مسافت کرنے والے مسافر کی منزل کہیں کھو جائے۔

میں نے پیار کی خاطر اپنوں کو ٹھکرا دیا۔زمانے بھر سے ٹکرا گئی۔ ہر طوفان کا مقابلہ ڈٹ کر کیا۔اذیت برداشت کی،زخموں سے چور ہوئی۔بدنامی کے طوق گلے میں لٹکائے۔مجھے بدلے میں ملا بھی تو کیا ملا۔محبوب ہرجائی ہو گیا۔اپنے بھی روٹھ گئے۔زندگی سنسان صحرا کی مانند ہو کر رہ گئی۔آنسوؤں نے اپنے ڈیرے جما لیے۔غموں نے اس نگر کا راستہ دیکھ لیا۔آہیں، سسکیاں مقدر بن گئیں۔جس کا اعتبار کیا،جسے دل دیا۔وہی دل توڑ گیا۔اسی نے ہزاروں زخم نام کر دیئے۔اسی نے زندگی کے پھول مرجھا دیئے،محبت کے چراغ بجھ گئے۔حسین سپنے بکھر گئے۔کیا یہی پیار ہوتا ہے۔؟کسی کی زندگی سے کھیل کر نجانے ان جھوٹے

عاشقوں کو کیا ملتا ہے۔محبت کے جال پھینک کر جسموں کی خواہش رکھنے والے،خود کیسے خوش رہتے ہوں گے۔؟ کیسے جیتے ہونگے۔؟

میرا نام عندلیب ہے۔ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔سب سے بڑا بھائی بیرون ملک رہتا ہے۔دوسرا نمبر میرا ہے۔باقی مجھ سے چھوٹے ہیں۔میرا بچپن اٹھکلیاں کرتے گزر گیا۔ماں باپ کی محبت،چاہت سے زندگی کا سفر دھیرے دھیرے طے کرنے لگی۔جب تھوڑی سمجھ بوجھ آئی تو مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔روز صبح سویرے امی بڑے ناز،لاڈ سے میری یونیفارم تیار کرتی۔میری کتابیں بیگ میں رکھتی، پیارے پیارے ہاتھوں سے محبت بھری نگاہوں سے ناشتہ کرواتی اور پھر بیگ میرے کندھوں پر سجا دیتی،ماتھے پر ماں جی کی محبت کا بوسہ لیتی۔اپنی سہیلیوں کے ہمراہ سکول روانہ ہو جاتی۔میری سہلیاں اسی گاؤں کی تھیں۔اسکول بھی تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

میں جلد ہی سہیلیوں کی کمپنی پا کر گھل مل گئی۔میری استانیاں بڑی رحم دل تھیں۔بڑی محبت ،محنت سے ہمیں پڑھاتی تھیں۔انہی محبتوں ،چاہتوں کے زیر اثر ایک کلاس سے،دوسری کلاس کا سفر ہوتا رہا اور پھر پرائمری اعلیٰ نمبروں سے پاس کرلیا۔پانچ سالہ دوستی جدائی کے کرب ناک لمحوں میں بدل گئی۔سبھی سہلیاں جدا ہوگئیں۔وہ استانیاں وہی رہ گئیں۔

گھر والوں نے آگے پڑھانے سے انکار کردیا۔نجانے ہمارے معاشرے میں یہ پابندیاں کب ختم ہونگی۔لیکن میرے شوق،چاہت نے ہتھیار نہ ڈالے۔میں امی کے آگے التجائیں کرتی رہی۔ابو تو بیرون ملک کام کرتے تھے۔ان کے آگے بھی ریکوسٹ کی گئی۔لیکن بے سود۔پھر آخر ماموں جان کے قدم پکڑے۔آخری اُمید وہی تھے۔ماموں جان مجھے بہت پیار کرتے تھے۔میں ہر بات ان سے منوا لیتی تھی۔ماموں جان کی گھر میں کوئی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔جب میں نے ماموں جان کو ریکوسٹ کی تو انہوں نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور وعدہ کیا کہ عندلیب تم ضرور آگے پڑھوگی۔میں ابھی آپ کے امی،ابو سے بات کرتا ہوں۔پھر واقعی انہوں نے میرے والدین کو راضی کرلیا۔میں بہت خوش ہوئی،میری خوشی دیدنی تھی۔میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔پھول کلیاں،میرے آنگن میں خوشبو پھیلانے لگیں۔

میں پھر سے کتابیں اٹھائے ہائی اسکول میں داخل ہوگئی۔پرائمری سے ہائی اسکول تک کا سفر سہانہ تھا۔سہیلیوں کے ساتھ شرارتیں،کھیل کود نجانے اب کہاں رہ گئے ہیں۔؟اب تو وہ کلاس روم یاد آتا ہے،جہاں کبھی بیٹھنے سے گھبراتی تھیں۔

چھٹی کلاس میں چند دن تو بوریت رہی۔ماحول نیا تھا۔دوست نئے تھے،اساتذہ نئے تھے۔آہستہ آہستہ جان پہچان ہوتی گئی۔دوستیاں بڑھتی گئی،ہنسی مذاق،کھیل کود نے زندگی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔چھٹی سے ساتویں،ساتویں سے آٹھویں اور پھر یونہی میٹرک پاس کرلیا۔

ایک مرتبہ پھر جدائیاں آڑے آگئیں۔سہلیاں بچھڑ گئیں۔کچھ نے کالج جوائن کرلیا،کئی میری طرح گھر بیٹھ گئیں۔کئی پیا گھر سدھار گئیں۔نہ وہ ماحول رہا،نہ وہ کلاس روم رہا،نہ وہ دوست رہے۔سب کچھ ختم ہوگیا۔زندگی نے اپنا رخ بدل لیا۔

میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن وہی گاؤں کی رسم ورواج میری راہوں میں رکاوٹ بن گئے۔گھر والوں نے معاشرے کی حیوانیت کا لمبا چوڑا لیکچر سنا کر ترک پڑھائی کا اعلان کردیا۔میں بہت روئی۔چیخی،چلاتی رہی۔میری کسی نے آہ وفریاد نہ سنی،میری التجائیں رائگاں گئی۔میں نے ماں جی کے آگے ہاتھ جوڑے۔ابو کے سامنے گڑگڑائی۔بھائی کو راضی کرنے کی کوشش کی۔مگر بے سود،وہی دیہاتی رسمیں،وہی رواج نے میرے سہانے سپنے چکنا چور کردیئے،میرے مستقبل کو نگل لیا۔

امی کہتی پڑھ لکھ کر کیا کروں گی۔آخر کسی کا گھر ہی تو آباد کرنا ہے۔کون سی نوکری کرنی ہے۔نجانے ہماری سوچیں کب بدلیں گی۔؟لڑکوں کو اس لیے پڑھایا جاتا ہے کہ انھیں جاب کر کے گھر کا نظام چلانا ہوتا ہے۔اور لڑکیاں بیچاری تعلیم سے محروم رہتی ہیں۔لڑکیوں نے کسی نہ کسی کا گھر بسانا ہوتا ہے۔ان کو کیا ضرورت پڑھائی کی۔

ارے نادانوں ماں پڑھی لکھی ہوگی تو معاشرہ پڑھا لکھا ہوگا۔شعور کی تمام حدیں عبور کرئے گا۔کیا تعلیم صرف اور صرف جاب حاصل کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔تعلیم تو انسان کو بے شعوری زندگی سے نکال کر شعور کی منزلیں طے کرواتی ہے۔

نجانے ہم جاہلیت دور کی پرانی رسمیں، پرانے رواج کب چھوڑیں گے۔؟ آج دنیا نے ترقی تو کر لی مگر عورت آج بھی جاہلیت کے دور کی طرح مظلوم ہے۔عورت کے ساتھ وہی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ جو گھر کی رونق ہوتی ہے، اسے دربدر کیا جاتا ہے۔ جو مردوں کی شان، عزت ہوتی ہے۔اسی کو بازاروں میں نیلام کیا جاتا ہے۔ مرد ہی عورت کا محافظ ہے اور مرد ہی عورت کا بیوپاری۔ نجانے مغربی کلچر، مغربی تہذیب ہماری جان کب چھوڑے گا۔؟

خیر میں گھر کی ہو کر رہ گئی۔ میرا تعلیمی سلسلہ یہی تک تھا۔قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ گھریلو کام کاج میں سارہ دن مگن رہتی۔ زندگی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ پڑھائی کا جنون تھا لیکن یہ جنون کہیں دب رہا تھا۔ میں مختلف جرائد، بکس، رسائل لے کر پڑھنے لگی۔

مجھے شعر و شاعری بہت پسند تھی۔ چڑھتی جوانی، نیا رنگ روپ، اُبھرتے جذبات، امنگیں جنم لے رہے تھے۔ میں نے گھر والوں کو یہاں تک کہا، چلو مجھے حافظہ کا کورس کرنے دو۔ قرآن مجید حفظ کرنے دو لیکن اس کی سہولت ہمارے گاؤں میں نہیں تھی۔ اس کے لیے راولپنڈی جانا پڑتا۔ راولپنڈی گھر والے کبھی جانے نہیں دیتے تھے۔ یونہی یہ شوق بھی دفن ہو کر رہ گیا۔ میں قیدی پرندے کی طرح پنجرے میں پھڑ پھڑاتی رہی۔

کس کو فکر تھی جو میرے لیے سوچتا۔؟ کون تھا میرا۔؟ کوئی بھی تو نہیں تھا جو درد دل کی سنتا۔ جب اپنے ہی نشمن کو آگ لگا دیں تو غیروں سے کیا امیدیں رکھنی اور لڑکیاں تو ہوتیں ہی ظلم سہنے کے لیے ہیں۔

یہ معصوم کلیاں کبھی اپنوں کے ہاتھوں لٹتی ہیں۔ کبھی غیروں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ کبھی عزت کی حفاظت کرتے، کرتے جان دے دیتی ہیں۔ کبھی رسموں و رواجوں کی بھینٹ چڑھ جاتیں ہیں۔

دنیا چاند ستاروں پر تو پہنچ گئی ہے، لیکن اس کی سوچ نہیں بدلی، عورت کے ظلم نہیں بدلے، عورت کی تقدیر نہیں بدلی۔ کبھی بھائی پر قربان، کبھی گھر پر قربان۔

عورت کی اپنی زندگی کہاں ہوتی ہے۔۔؟ وہ تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے۔ لڑکی، عورت اپنی زندگی جیتی ہی کب ہے؟ کبھی باپ کے گھر، کبھی بھائی کے گھر، کبھی شوہر کے گھر اور بالآخر مٹی کے گھر میں ہمیشہ کے لئے سو جاتی ہے۔ بے نام سی زندگی گھر کی چار دیواری میں گزار دیتی ہے۔ اور یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔ اس کی سبھی خواہشیں دفن ہو جاتیں ہیں۔ اس کے احساسات، جذبات کی قدر کہاں ہوتی ہے۔ اسے تو صرف اور صرف کھلونا سمجھا جاتا ہے۔ وقت گزاری کے لئے، جھوٹی تسکین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی بازاروں میں فروخت کی جاتی ہے، کبھی محفلوں کی رونق بنائی جاتی ہے۔

آئے عورت تیرے نصیب ایسے کیوں ہوتے ہیں۔۔؟ کیا تمھیں بائیں پسلی سے جنم لینے کی سزا دی جا رہی ہے۔ تو اس لئے مظلوم ہے کہ تیرا وجود مرد ذات سے جنم لے کر آیا ہے۔ تیری اپنی زندگی کوئی بھی نہیں۔

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ وبازار میں
عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے

کاش نیلے آسمان والا مجھے لڑکا پیدا کرتا۔کم از کم آزاد زندگی تو جیتی۔اپنی خواہشات،اپنے جذبات دفن نہ کرنے پڑتے۔پابندیوں کے جال نہ ہوتے۔ظلم کی زنجیریں میرے پاؤں میں نہ ڈالی جاتیں۔کاش لڑکیاں اپنی زندگی جی سکتی۔

میری زندگی میں لفظ کاش ہی ہے۔میری خوشیاں،میری حسرتیں،میرے ارمان،میرے خواب سب ٹوٹ گئے۔جو سپنے تھے،طوفان کے نذر ہو گئے۔میرے خواب چکنا چور ہو گئے۔اپنے غیر ہو گئے۔من میں بسنے والے دُور بہت دور چلے گئے۔گھر میں بوریت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

نجانے یہ سپنے ٹوٹنے کے لئے کیوں ہوتے ہیں۔۔؟ارمان بکھرنے کیلئے کیوں ہوتے ہیں۔؟رشتے ٹوٹنے کے لئے کیوں ہوتے ہیں۔۔؟دوست بچھڑنے کے لئے کیوں ہوتے ہیں۔۔؟

میں نے بوریت ختم کرنے کے لئے جرائد پڑھنے شروع کر دیئے۔ساتھ ساتھ شاعری کی ڈائری بنائی گئی۔مجھے شاعری اچھی لگتی تھی۔میرے جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔جیسے یہ غزل ہے.

اشک گرتے ہیں میری سانس سنبھل جاتی ہے
دے کے اک درد نیا شام نکل جاتی ہے
اس کو دیکھوں تو میرے درد کو ملتا ہے سکون
اس سے بچھڑوں تو میری جان نکل جاتی ہے
عشق کچھ ایسے مٹاتا ہے نشان ہستی
جیسے ہر رات اُجالے کو نگل جاتی ہے
زخم بھرتا ہی نہیں اس کی جدائی کا مگر
پھر اس کی یاد نیا درد اُگل جاتی ہے
وہ اگر دل پہ میرے ہاتھ ہی رکھ دے
ٹوٹے سانس بھی کچھ دیر سنبھل جاتی ہے

بچپن کب کا بیت چکا تھا۔میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔جوانی تو سر چڑھ کر بولتی ہے۔میری اُمنگیں جوان ہو گئیں۔مجھ پر بھی شباب آیا۔

جھیل سی آنکھیں،چمکتے دودھیا دانت۔گلابوں جیسے ہونٹ،ستواں ناک،سمارٹ جسم،مستانی چال،جوان ادائیں کیا کچھ نہیں تھا میرے

پاس۔میرے رب نے خوب حسن سے نوازہ تھا۔آئینے کے سامنے جب سنورتی تھی تو خود سے ہی شرماجاتی۔آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے شہزادے کے سپنے دیکھتی۔مجھے بھی کسی کی تلاش تھی،کسی کا انتظار تھا۔من ہی من میں کسی کو یاد کرتی تھی۔وہ میرے سپنوں کا راج کمار تھا۔لیکن کون تھا۔۔؟کہاں تھا۔۔؟نہیں معلوم تھا۔

میرے اندر محبت کے جذبات جنم لے رہے تھے۔پھر محبت تو ذات،پات،عمر کچھ بھی نہیں دیکھتی۔رنگ روپ نہیں دیکھتی،محل جھونپڑی نہیں دیکھتی۔محبت دین،مذہب نہیں دیکھتی،امیری،غریبی نہیں دیکھتی۔اسی لئے تو کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی،ہوجاتی ہے۔

میری آنکھوں میں سپنے تھے۔دل میں ارمان تھے۔اللہ تعالیٰ نے مجھے خوب روپ دیا تھا۔گندمی رنگ،گھنے سیاہ بال،قد و قامت دیدنی تھی،نشیلی آنکھیں۔جو بھی دیکھتا،دیکھتا رہ جاتا۔میں اپنی دنیا میں مگن صرف سپنے دیکھتی تھی۔سپنوں کی دُنیا میں رہتی تھی۔

پھر ایک دن زندگی نے نیا موڑلیا۔سب کچھ بدل گیا۔میری امی کے موبائل پر کال آئی۔جو کہ ان نون نمبر سے کال آرہی تھی۔اکثر میں ہی کالز اٹینڈ کرتی تھی۔مجھے زمانے کی اونچ نیچ کا پتہ نہیں تھا۔مردانگی آواز مجھ سے مخاطب تھی۔جو مجھ سے میرا نام،تعلیم پوچھنے لگا تھا۔نجانے کوئی اخباری جیسے انٹرویو لے رہا ہو۔لیکن میں نے کھری کھری سنادی۔

اے لڑکے کس مقصد سے کال کی ہے۔؟مطلب بتاؤ،میرے نام سے کیا غرض ہے۔۔؟کیسا دیوانہ تھا۔۔؟میری آواز پر مرمٹا تھا۔

آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے ندی کنارے،کسی درخت پر بیٹھی کوئل سریلے گیت گارہی ہو۔

شٹ اپ۔کیا بکواس ہے۔۔؟انہی الفاظ کے ساتھ میں نے کال بند کردی۔اس دن کے بعد نجانے مجھے کیا ہوگیا۔وہ کیسے میرے دل میں بس گیا۔۔؟میں نہیں جانتی۔اس نے کیسے،کب دل میں جگہ بنالی۔؟روز ایس ایم ایس کرتا۔اس میں شاعری ہوتی،شاعری بہت اچھی ہوتی،شاعری کی تو میں دیوانی تھی۔اسے اپنی ڈائری میں محفوظ کرتی رہتی۔پھر یوں ہونے لگا جس دن اس کا میسج نہیں آتا تھا۔مجھے بے چینی سی ہوتی۔دل کو قابو کرتی۔بار بار نظریں موبائل پر جارکتی۔دل کو تسلی کراتی مگر دل تھا کہ بے قابو ہوا جارہا تھا۔مجبوراً اسے میسج کردیتی کہ مجھے اچھے اچھے میسج سنڈ کرو۔پھر یونہی ہماری دوستی ہوگئی۔

اس کا نام ابرار تھا۔کبھی کبھار ہماری کال پر بات ہوجاتی۔اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔دوستی کا رشتہ کب محبت میں تبدیل ہوگیا۔۔؟معلوم نہیں ہوا۔

ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔کالز کا لمبا سلسلہ چل نکلا۔ایک دوسرے سے پسند ناپسند پوچھی جاتی۔ہمارا کھانا،پینا،اُٹھنا،بیٹھنا،جاگنا ایک وقت ہوتا تھا۔ساتھ جینے مرنے کے عہدوپیمان ہوتے۔حسین سپنے ہوتے اور ہم ہوتے۔روز نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجاتے تھے۔اپنا گھر ہوگا،اپنا آشیانہ ہوگا،پھول کھلیں گے،کلیاں مہکے گی،کوئل کوکے گی،بلبل گائے گی،چاند ہوگا،ستارے ہونگے،چاندنی ہوگی،ہم ہونگے،ہاتھوں میں ہاتھ ہوں گے،ساتھ جئیں گے،ساتھ مریں گے۔

ہزاروں سپنے ہوتے۔مگر کہتے ہیں ناں سپنے کبھی پورے نہیں ہوتے۔سپنے ہوتے ہی ٹوٹنے کے لئے ہیں۔وہ خواب ہی کیا جو بکھریں

نا۔خواب تو کرچی کرچی،ریزہ ریزہ ہوکر بکھرنے کے لئے ہوتے ہیں۔پھر جاگتی آنکھوں کے خواب تو زیادہ اذیت دیتے ہیں۔

ہماری محبت پروان چڑھتی رہی۔عہدوپیمان ہوتے رہے۔ایک دن ابرار نے کہا عندلیب اپنا دیدار تو کرادو۔ملنا مشکل،دشوار ضرور تھا۔مگر ناممکن نہیں تھا۔ابرار راولپنڈی میں رہتا تھا۔گھر کا واحد کفیل تھا،دو سسٹرز اور بوڑھی ماں تھی۔اس کا باپ کب کا وفات پا گیا تھا۔

میری خالہ بھی راولپنڈی میں رہتی تھی۔کافی عرصہ ہوا تھا۔میں خالہ کے ہاں بھی نہیں گئی تھی۔پھر کیا محبوب کے دیدار کے لئے سو،سو جتن کیے،بہانے بنائے۔آخر کار اجازت مل گئی اور چند دن کے لئے خالہ کے ہاں چلی گئی۔

ایک دن موقع پا کر ابرار کو کہہ دیا کہ جانو دیدار کرا جاؤ۔ابرار میری خالہ کے گھر کے تھوڑے ہی فاصلے پر نوکری کرتا تھا۔میرے پاس موبائل نہیں تھا۔اپنی سہیلی سے ادھار لے آئی تھی۔کیونکہ گھر والا موبائل کیسے لے آتی۔۔؟صبح سویرے ہی اس نے کال کی۔میں آرہا ہوں۔کہاں ملوگی عندلیب۔؟میں نے اسے سارا راستہ سمجھا دیا۔خالہ کے گھر کے ساتھ ہی چھوٹا سا پارک بنا ہوا تھا۔میں گھر سے کوڑا کرکٹ باہر پھینکنے کے بہانے نکل آئی۔گھر سے کچرا اٹھائے،دروازہ کراس کرکے سڑک کے پار جانا تھا۔سڑک کے اس پار گھر کے سامنے ابرار کھڑا تھا۔اس نے مجھے نشانی بتائی کہ میں نے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔اور ویسے بھی محبوب،عاشق ایک دوسرے کو دور سے پہچان لیتے ہیں۔میں کوڑا کرکٹ پھینکنے سڑک کے اُس پار چلی گئی۔ابرار درخت کے سائے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔پارک کے تکونی کونے میں لگا۔

سایہ دار درخت ہماری محبت کا راز دان تھا۔ابرار بلیو پینٹ،نیلی شرٹ میں بہت سندر لگ رہا تھا۔رنگ سانولا تھا۔محبت ہر رنگ روپ تھوڑا دیکھتی ہے۔یہ تو دلوں کے بندھن ہوتے ہیں،جو اعتبار کے کچے دھاگے میں بندھے چلے جاتے ہیں۔درمیانہ قد،سمارٹ جسامت،آنکھوں پر سیاہ چشمہ سجائے،بال سنوارے ہوئے میرا منتظر تھا۔اس کے مقابلے میں،میں حسین خوبصورت تھی۔قد کاٹھ بھی اس سے تھوڑا بڑا تھا۔دُبلی پتلی جسامت،بلیک کلر کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔

میں نے جاتے ہی سلام کیا۔ابرار نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔میں نے صرف ہاتھ ملایا۔محبت کا تقاضا تھا۔ورنہ ہاتھ بھی نہیں ملانا تھا۔فقط ایک دوسرے کا دیدار کرنا تھا۔نظروں کی پیاس بجھ گئی۔دیدار کی حسرت جو تھی پوری ہوگئی۔جس کے سپنے روز دیکھتی تھی۔آج آنکھوں کے سامنے تھا۔نظروں نے خوب پیاس بجھائی۔اردگرد کوئی شاپ نہیں تھی۔میں اپنے دلبر کی مہمان نوازی کرتی۔گھر لے کر جا نہیں سکتی تھی۔خالہ کا گھر تھا،شکر ہے ڈرتے ڈرتے دیدار تو کرلیا تھا۔

میں نے اپنے من کے شہزادے کو کہا۔میری جان اِدھر رکو میں پانی لے کر آتی ہوں۔واپس گئی۔پانی لیا اور اپنے ہاتھوں سے محبوب کو پانی دیا اور معذرت کی کہ ابرار میں معذرت خواہ ہوں۔میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکی۔

پرایا گھر تھا اور اپنے گھر سے کوسوں دور بھی۔میں کر بھی کیا سکتی تھی۔؟زمانے کی نظروں سے بچنا بھی تھا۔

ابرار میرے لئے موبائل لے کر آیا تھا۔اس نے دور سے آتے شخص کو دیکھ کر جلدی سے ڈبہ بند موبائل زمین پر رکھ کر جانے لگا۔مجھے اشارہ کیا کہ اٹھالو۔میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔وہ شخص ابھی دور تھا۔میں نے فوراً موبائل اٹھا کر کپڑوں میں چھپا لیا اور ہاتھوں کے اشاروں سے محبوب

کوالوداع کیا۔اور گھر کی طرف چل پڑی یہ ہماری محبت کی پہلی ملاقات تھی۔محبوب کا دیدار ہو گیا تھا۔نظروں کی پیاس بجھ گئی تھی۔دل مسرتوں کی وادیوں میں ناچ رہا تھا۔انگ انگ خوشبو سے معطر تھا۔

عجیب سی خوشی تھی۔اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ایسا لگتا تھا سڑک کے اردگرد لگے درخت میری محبت کے گیت گا رہے ہوں،ہواؤں کی مستی میں جھومتے پھول سر جھکائے سلامی پیش کر رہے تھے۔

گھر پہنچی تو درو دیوار مبارک باد دے رہے تھے۔میرے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کو خالہ نے بھانپ لیا۔تب ہی تو خالہ نے پوچھا لیا تھا۔

ارے عندلیب بیٹا! آج بہت خوش نظر آرہی ہو۔جب سے میرے گھر میں آئی ہو۔آج ہی کھلکھلا رہی ہو۔خیر تو ہے۔؟بس خالہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔

ایک انجانی سی خوشی ہے۔میں کوڑا کرکٹ باہر پھینکنے گئی تھی۔ایک دیوانہ،مستانہ،فقیر پیا سا تھا۔اس نے پانی مانگا۔پانی پلایا تو مجھے ہزاروں دعائیں دے رہا تھا۔دلی مُرادیں پوری ہونے کی نوید دے رہا تھا۔تب سے خوش ہوں۔اب خالہ کو کیا خبر وہ دیوانہ،مستانہ،کوئی اور نہیں میرے دل کا شہزادہ تھا۔یہ عشق بھی نا جانے کیا کچھ کرواتا ہے۔اپنے ہی ہاتھوں،اپنوں کے گلے کٹواتا ہے۔ہائے رے عشق تیرا ستیاناس ہو۔

خیر دن گزر گیا۔سورج ڈھل گیا۔پرندے واپس گھونسلوں کو لوٹ آئے۔اندھیرا پھیلنے لگا،شام ہوگئی۔سبھی کام کاج ختم ہو گئے تب ہی کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔اندر سے دروازہ لاک کیا۔محبوب کا دیا گفٹ کھولنے لگی۔اس ڈبے نما گفٹ میں پیارا سا موبائل تھا۔ساتھ سم بھی تھی۔

موبائل نکالا،آن کیا۔اس میں بے شمار پیارے پیارے ایس ایم ایس قید تھے۔میرے من کے شہزادے کی بہت سی تصویریں تھیں،ابرار کی تصویریں مجھے بہت پسند آئی۔ڈبے کے اندر آخر میں ایک لیٹر پرفیوم میں نہایا ہوا برآمد ہوا۔جس کی تحریر یہ تھی۔

"میری جان سے پیاری عندلیب"

سلام و محبت!

میرے سپنوں کی شہزادی،میری راج کماری،اُمید ہے ٹھیک ٹھاک ہو گی۔جب سے آپ سے رابطہ ہوا ہے۔میرے دل کی دُنیا خوشبوؤں کی وادیوں میں سیر سپاٹے کر رہی ہے۔زندگی معطر معطر ہے۔ایسا لگتا ہے میرے سپنے پورے ہونے والے ہیں۔میرا ویران آنگن آباد ہونے کو ہے۔صبح آپ سے ملاقات ہونے چلی ہے۔میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہوں۔اپنے آپ کو خوش نصیب ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔آپ کے لئے ایک موبائل اور سم خرید لی ہے۔صبح پیش کرنا ہے۔یہ موبایل میری یاد دلاتا رہے گا۔اسے دل سے قبول کرنا۔ہاں محبت کا اقرار کیا ہے تو میرا گفٹ دل و جان سے قبول کرنا ہو گا۔زندگی کی راہوں میں کبھی اکیلا،تنہا مت چھوڑنا۔زمانے کی بے رحم رسموں کی آگے دیوار بن جانا۔ہر طوفان کا مقابلہ کرنا۔میں آپ کو بہت خوشیاں دوں گا۔

ہاں میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔انکار مت کرنا۔زمانے بھر کی تمام خوشیاں تمھارے قدموں میں بچھادوں گا۔اگر تم نے ٹھکرا دیا تو جیتے جی مر جاؤں گا۔موت کو گلے لگالوں گا۔بس میری محبت کا بھرم رکھنا،تمھارا ساتھ ہی میری زندگی ہے۔اس زندگی کو موت کے حوالے نہ کرنا۔نظروں کی پیاس اُمید ہے صبح بجھ جائے گی۔من کی حسرت ،دیکھنے کی تمنا،دیدار کی چاہ پوری ہوگی۔واپسی کا انتظار ہے گا۔دعاؤں کے ساتھ اجازت طلب ہوں۔اللہ حافظ!

فقط

آپ کا چاہنے والا

ابرار احمد

خط کیا تھا۔میری جان تھا۔میں نے خط پڑھ کر چوم لیا۔کئی بار سینے سے لگایا۔دل بہت خوش ہوا۔کوئی تو ہے جو مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔مجھے پیار کرتا ہے۔مجھے اپنانا چاہتا ہے۔میرا ہونا چاہتا ہے۔یہ محبت نامہ آج بھی میرے ساتھ،میرے پاس ہے،میرے پاس محفوظ ہے۔

میں نے موبایل اٹھایا۔اپنی جان کا شکریہ ادا کیا کیونکہ سم میں کافی بیلنس موجود تھا۔پریشانی کیا ہونی تھی۔میری جان ابرار اتنا پیارا گفٹ اور لیٹر لکھنے کا شکریہ۔میری جان میں اپنی جان دے دوں گی،مگر تمھارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔میری جان میں بھی تمھیں حد سے زیادہ چاہتی ہوں۔زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دوں گی۔زمانہ چاہے لاکھوں ستم کرے۔جو وعدے کیے ہیں،نبھائے گے۔جو قسمیں کھائی ہیں،پوری کریں گے۔میرا جینا مرنا آپ کے لئے ہے۔میرے سپنوں میں تم ہو۔میری روح میں تم ہو۔تم ہی میری خوشی،تم ہی میری چاہت ہو۔سدا مسکراتے رہنا۔کبھی بے وفائی نہ کرنا۔ورنہ میں مر جاؤں گی۔

محبت نامہ کا جواب میں نے کال پر دے دیا۔ڈھیروں پیار بھری باتیں ہوتی رہی۔رات بھی اپنا سفر کر رہی تھی۔پوری دُنیا محو خواب تھی اور یہ پریمی مستقبل کے پلان بنا رہے تھے۔ہزاروں وعدے،قسمیں کھائی،ساتھ جینے مرنے کا اقرار کیا۔

نا چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو الوداع کیا۔کال منقطع ہوئی اور میں محبوب کے سپنوں میں گم ہو کر حسین وادیوں میں سیر کرنے نکل گئی۔میرے خوابوں،خیالوں میں صرف اور صرف میرا محبوب تھا۔اس کی باتیں تھیں،اس کی مسکراہٹ تھی۔پھر یونہی ہماری محبت پروان چڑھتی رہی۔میں خالہ کے گھر چند دن رہنے کے بعد اپنے در و دولت لوٹ آئی۔

ہماری محبت کی ٹرین مختلف اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی منزل کی طرف محو سفر تھی۔کبھی دشوار راستے،کبھی حسین وادیاں ہوتیں۔کبھی بہتی آبشاریں،کبھی دریا عبور کرتی۔کبھی پہاڑوں کو چیر کر آگے بڑھتی رہی،کبھی پتھروں سے،کبھی کُھلے میدانوں،کبھی ریگستانوں،کبھی جنگلوں سے گزرتی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

اسی طرح ہماری محبت کو چار سال بیت گئے۔کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔دو پریمی پیار کے نگر آباد کیے ہوئے تھے۔پھر طوفان برپا ہوا،ایک سیلاب آیا،اور زندگی کی ساری خوشیاں اس میں بہہ گئی۔

کہتے ہیں ناں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ سو میری محبت بھی عیاں ہو گئی، میری ماں کو خبر ہو گئی کہ عندلیب کے پاس ذاتی موبائل ہے اور یہ کسی لڑکے سے بات کرتی ہے۔ پھر کیا تھا۔۔؟ ایک نہ ختم ہونے والا درد کا سمندر زہریلے سانپ کی طرح منہ پھیلائے کھڑا تھا۔ زمانے نے ستم ڈھائے۔ پریموں نے قربانی دی۔ زمانہ ہنستا رہا، پریمی تڑپتے رہے، ظلم ہوتا رہا، زخم ملتے رہے۔ روز سولی چڑھتے تھے، روز مرتے، روز جیتے تھے۔

میرے والد صاحب بھی وطن واپس آ گئے۔ مجھے خوشی کیا ہونی تھی۔ میری تو دُنیا برباد ہو رہی تھی۔ حسین سپنے ٹوٹ رہے تھے۔ آنکھیں برس رہی تھی۔ دل خون کے آنسو روتا تھا۔ پھر کیا تھا، ابو کو بھی پتہ لگ گیا۔ ناراض ہونے لگے، عرصے بعد گھر آئے تھے، محبت جتاتے لیکن وہ بھی ستم ڈھانے لگے۔ مجھے مارنے لگے۔ پابندیاں لگائی گئی، لیکن پریمی کب ڈرتے ہیں۔ محبوب کے لئے جان دینے والے، محبوب کو تڑپاتے تھوڑے ہیں۔ میرے لبوں پر صرف ایک ہی نام مچلتا تھا۔ وہ تھا ابرار، میرا سب کچھ وہی تھا۔ اپنوں نے ستم یہ کیا کی میری شادی کا عندیہ دے دیا۔

میرا کزن احمد جو بچپن میں ہمارے گھر رہتا تھا۔ ہم اکٹھے اُٹھتے بیٹھتے تھے، اکٹھے پڑھتے، کھیلتے، کودتے تھے۔ بچپن میں ہی اس کے والدین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے ماما، پاپا اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ معصوم سی صورت، شرمیلا سا، اپنی دُنیا میں گم رہنے والا۔ گم سم سا۔ میں اُسے بھائی سمجھتی تھی۔

مجھے کیا خبر تھی۔؟ وہی میرا رقیب بن کر سامنے آئے گا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ صرف کزن کی حد تک ہمدردی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا اس کے ساتھ ہنس کھیل لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اسے زندگی کا ہمسفر بنا لیتی۔ اپنی زندگی اس کے نام کر دیتی۔ میرے ماما، پاپا نے جب یہ عندیہ دیا کہ احمد سے تمھاری شادی طے کر دی ہے۔ کسی اور کے سپنے دیکھنے بند کرو اور نہ ہی ایسا ہم کرنے دیں گے۔ بہتر ہے ہماری ہی مرضی میں راضی جاؤ۔ ورنہ بکھر جاؤ گی، کوئی تمھارا نہیں رہے گا۔ لیکن میری ضد ایک ہی تھی۔

چاہے مجھے سولی پہ لٹکا دو، پروا نہیں۔ شادی ہو گی تو صرف ابرار سے ہو گی ورنہ کبھی نہیں ہو گی۔ ابرار نہیں تو کوئی نہیں۔ میں نے اپنی محبت کا پردہ فاش کر دیا۔ سب کو بتا دیا کہ میرے سپنوں کا راج کمار ابرار ہی ہے۔ میری زندگی اسی کے نام وقف ہے۔

جب ماما، پاپا کی نہ مانی تو انہوں نے میری خالہ کو گھر بلوا لیا۔ خالہ نے مجھے ہزاروں سبز باغ دکھائے۔ احمد ایسا ہے۔ احمد یہ ہے، وہ ہے تم اس سے شادی کر لو۔ ابرار کا کیا پتہ، غیر ہے کل کو دھوکا دے دے۔ تمھاری زندگی تو برباد ہو جائے گی۔ تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ زمانہ تمھیں جینے نہیں دے گا۔ در، در کی ٹھوکریں تمھاری مقدر بن جائیں گی۔ بکھرے، ٹوٹے لوگوں کو کوئی گلے نہیں لگاتا۔ لوگ تو گرے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اُٹھا لیتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کو زمانے والے اذیتیں دیتے ہیں۔ زخموں پر مرہم نہیں رکھتے۔ زخموں پر نمک چھڑکنے والے بہت ہیں، میری بات مانو تم احمد سے شادی کر لو۔ اچھا لڑکا ہے اور اپنی برادری کا ہے۔ خوبصورت بھی ہے۔ تمھیں خوش رکھے گا۔ تمھاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ تمھارے سارے سپنے، سارے ارمان پورے ہوں گے۔

خالہ مجھے سپنوں کی وادیوں میں سیر کرانے لے گئی۔ مگر اس کی ہر بات سر سے اوپر گزر جاتی۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ علم نہیں تھا۔ عشق کا جو

ت سوار تھا۔ابرار نے نا جانے کیسا جادُو کر دیا تھا اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔میرا سب کچھ تو ابرار تھا۔بس وہی میری منزل تھی۔اس کے علاوہ میرے من مندر میں کوئی نہیں تھا۔میرا اعتبار وہی تھا،میری صبح شام،دن رات وہی تھا۔پھر جن کو دل میں بسایا جاتا ہے۔بیچ سفر میں چھوڑا نہیں جاتا۔ان کے ارمانوں کا جنازہ نہیں نکالا جاتا۔

ایک دن موقع پا کر میں نے ابرار کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔جان میرے گھر والوں نے موبائل چھین لیا ہے۔میرے اوپر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔تم جلد ہی کوئی حل نکالو ورنہ تیری عندلیب تیری نہیں رہے گی۔عندلیب تیری نہ بنی تو موت کو گلے لگا لے گی۔

ابرار نے مجھے حوصلہ دیا۔عندلیب میری جان تم حوصلہ رکھو۔میں جلد کچھ کرتا ہوں۔بس تم انکار ہی کرتی رہو۔تم نے رضامندی نہیں کرنی۔تم میری ہو۔میری ہی ہم سفر بنو گی۔میں تمھیں اپنا لوں گا۔تم میری ہی دلہن بنو گی۔جلد ہی میں اس قید خانے سے آزاد کراؤں گا۔تھوڑا وقت دو۔میں غریب ضرور ہوں مگر اپنی محبت کو رسوا نہیں ہونے دوں گا۔اپنی چاہت ضرور حاصل کروں گا۔مجھے بھی حوصلہ ہوا کہ ایسے حالات میں ابرار میرے ساتھ ہے۔وہ ہر طوفان،ہر ستم کا مقابلہ کرے گا،ظلم کی ہر دیوار گرا دے گا۔وہ مجھے مرنے نہیں دے گا۔وہی میرا سر تاج بنے گا۔اسی کے نام کی مہندی لگاؤں گی۔اسی کی ڈولی میں بیٹھوں گی۔وہ آئے گا۔بارات لائے گا،ڈھول بجیں گے۔شہنائیاں گونجے گی،لوگ رقص کریں گے،سہلیاں گیت گائے گی۔میرا شہزادہ گھوڑی پہ آئے گا۔مجھے لے جائے گا۔

باہر تو طوفان برپا تھے مگر دل کی دُنیا خوش تھی۔مجھے یقین تھا۔کیا ہوا ابھی کشتی بھنور میں ہے۔جلد ہی کنارے پہ ہو گی۔ساحل دور نہیں،جلد خوشیاں لوٹیں گی۔زندگی پھولوں کی سیج پہ ناچے گی۔پھولوں کی سیج پہ رقص ہو گا۔محبت جیت جائے گی۔زمانہ ہار جائے گا۔میرے اندر صبر تھا۔حوصلہ تھا،ہمت تھی۔

ابرار سے بات ختم کی اور ہمت کر کے احمد کو کال کر دی۔دیکھو!احمد میں عندلیب بات کر رہی ہوں۔گھر والے بضد ہیں۔مجھے تم سے منسوب کر رہے ہیں۔لیکن میں تم سے نہیں کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔میں اس سے پیار کرتی ہوں۔میں نے انکار تو کر دیا ہے۔یہ لوگ میری نہیں سن رہے۔تم ہی انکار کر دو۔تم لڑکے ہو،تمھاری بات مانی جائے گی۔میں تمھاری عزت کرتی ہوں،تمھارے نام کی مہندی نہیں لگا سکتی۔تمھارے آنگن کی رونق نہیں بن سکتی۔میں ابرار کو چاہتی ہوں۔وہی میری منزل ہے۔پلیز میری بات سمجھو۔میری زندگی برباد ہونے سے بچا لو۔مجھے یقین ہے تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔میری زندگی پر رحم کرو۔میں تمھاری احسان مند رہوں گی۔

میں نے ساری داستان احمد کے گوش سماعت کر دی۔محبت میں حوصلہ آ ہی جاتا ہے۔محبت تو ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

چاہے تھا کہ احمد میرا ساتھ دیتا۔مجھے ہی بُرا بھلا کہنے لگا۔آگ بگولہ ہو گیا،ہزاروں گالیاں میرے نام کر دی۔تم ہماری عزت کا جنازہ نکال رہی ہو۔کون ہے کمینہ ابرار۔؟جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈلا۔میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔مجھے نمبر دو۔میں ابھی اس سے پوچھ لیتا ہوں۔محبت اور انا کی جنگ چھڑ گئی۔پھر کیا تھا۔ایک نئی قیامت میری منتظر تھی۔

احمد نے میرے پاپا کے خوب کان بھرے۔موبائل تو کب کا چھین لیا گیا تھا۔اب پابندیوں کی زنجیریں ڈال دی گئیں۔مجھے ایک کمرے

میں بند کر دیا گیا۔میں روتی رہی ،تڑپتی رہی۔کسی کو احساس نہیں تھا۔میں مر جاتی ،موت کو گلے لگا لیتی اگر ابرار کا خیال نہ ہوتا۔مرنا تو چاہتی تھی لیکن ابرار کا کیا ہوگا۔؟یہی سوچ کر صبر کے کڑوے گھونٹ پی جاتی۔زمانے کے زہر شدہ تیر روز میرے سینے میں پیوست ہوتے۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگی۔جہیز بنایا جارہا تھا۔میری خالہ نے مجھ سے وعدہ کیا،عندلیب فی الحال تم احمد سے شادی کرلو۔میری عزت رکھلو،میں جلد تمھاری طلاق کرادوں گی۔پھر تم ابرار سے شادی کرلینا۔ابھی برادری کی عزت کا سوال ہے۔تمھارے انکار سے بہت خون خرابہ ہوگا۔خالہ نے نجانے کیا سے کیا سبز باغ دکھائے۔؟سورج کی روشنی میں چمکتے ستارے دیکھائے۔اس کی شیریں ،میٹھی باتیں دل کو لگتی لیکن میرے من مندر میں صرف ابرار کا پہرہ تھا میں کیا کرتی۔؟خالہ سے کہا مجھے موبائل دلوادو۔میں ابرار سے آخری بار بات کر کے کہہ دیتی ہوں کہ مجھے بھول جاؤ۔

خالہ نے پیار سے ماتھا چوما۔مجھے دعائیں دینے لگی۔خالہ نے میرا یقین کرلیا۔شام کو موبائل مل گیا۔میں نے خالہ سے کہا۔میں ابرار سے تنہائی میں بات کروں گی۔خالہ نے میری بات مان لی۔پھر جب سب سو گئے۔میں نے اپنے دل کے شہزادے کو کال کی۔خوب گلے شکوے کیے۔پھر ساری صورت حال بتائی،مگر ابرار کا رویہ تبدیل تھا،ابرار پہلے والا نہیں رہا تھا۔کہنے لگا۔عندلیب تم ابھی شادی کے لئے ہاں کردو۔خالہ کی بات مان کر شادی کرلو۔میں بعد میں تمھیں اپنا لوں گا۔ابھی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔تمھارے گھر والے،تمھارے ساتھ ساتھ مجھے بھی ختم کردیں گے۔ابھی حالات سے سمجھوتہ کرلو۔تھوڑے عرصے بعد تم طلاق لے لینا۔جب تمھیں طلاق ہوجائے گی،پھر ہماری راہیں صاف ہونگی۔پھر کوئی نہیں روکے گا،ہمارا ملن ہوگا۔ضرور ہوگا۔

میں رودی۔خوب آنکھوں کا سمندر چھلکا۔ابرار یہ تم کہہ رہے ہو۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم بھی ایسا کروگے۔

نجانے کس نے اس کے کان بھر دیئے تھے۔؟کس نے دھمکی دی تھی،ابرار ایسا کبھی بھی نہیں تھا۔ابرار مجھ سے مخاطب ہوا۔ہاں عندلیب وقت کی نزاکت کو سمجھو۔وقت کی لہریں مخالف ہیں۔میرا یقین کرو،تم تو میری روح میں سمائی ہو۔ابھی میں مجبور ہوں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔میرے اُوپر بہت دُباؤ ہے۔نجانے ابرار کو کیا ہوگیا تھا۔؟پیار کرنے والے ایسا کب کرتے ہیں۔؟پر مجبوریاں ناکوں چنے چبوادیتی ہیں۔پھر کال منقطع ہوگئی۔ساری رات اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی۔اشکوں کے دریا بہتے رہے۔نمکین موتی آنکھوں کے نگر سے نکل کر رخساروں کو چومتے ہوئے،دامن بھگوتے زمین بوس ہوتے رہے۔

یہ آنسو کتنے وفادار ہیں۔خوشی ہو،غمی ہو،درد ہو،آہیں ہوں کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ظالم لوگوں سے،بے درد زمانے سے یہی آنسو اچھے جو مرتے دم تک ساتھ نبھاتے ہیں۔پیدا ہوتے ہیں تو آنکھوں میں چمکتے ہیں۔مرتے ہیں تو دوسروں کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔

کالی سیاہ رات گزرتی رہی،چاند بھی میری بے بسی پر اداس تھا وہ ستاروں کو میری داستان سنا رہا تھا۔آسمان خاموش تماشائی تھا۔بادل تو میرا غم برداشت نہ کر سکے،خوب ٹوٹ کر برسے۔بے درد زمانے نے اسے رحمت قرار دے دیا۔بادلوں نے دل کا غبار نکال لیا،ہر طرف جھل تھل ہوگئی۔زمین سیراب ہوگئی۔درخت نہا دھو کر صاف شفاف ہوگئے تھے۔ہرسوں بہار ہی بہار کا سماں تھا۔

میرے سارے غم اسی رات آنسوؤں میں بہہ گئے۔رات اپنا سفر مکمل کر چکی تھی۔صبح کا سورج طلوع ہونے کو تھا۔میں فیصلہ کر چکی تھی۔اپنے غموں کو من میں دفن کیے، آنسوؤں کو آنکھوں میں سجالیا۔غموں کا زہر پی لیا۔میں ہار گئی بے درد زمانہ جیت گیا۔

صبح کا سورج زندگی کا اک نیا موڑ لیا کھڑا تھا۔میں نے حامی بھر لی۔شادی کے لئے ہاں کر دی لیکن یہ من کی مرضی نہیں تھی، ظاہری خوشیوں میں شریک ہونا تھا۔خالہ سے وعدہ تھا شادی کے بعد میرا ساتھ دے گی۔سبھی میرا فیصلہ سن کر بہت خوش تھے۔خالہ کے دل میں نجانے شک کہاں سے پیدا ہو گیا۔؟یقین سے بے یقین ہو گئی۔اسے شک تھا کہ میں نکاح کے وقت اپنا فیصلہ بدلوں گی۔نکاح کے وقت ان کو برادری کے سامنے رسوا کروں گی۔اس نے یقین کے لئے کلمہ پڑھوایا، عہد لیا تب اسے یقین ہُوا۔

پھر کیا تھا۔اُدھر زندگی کی شہنائی بج رہی تھی۔اِدھر زندگی ماتم کر رہی تھی۔سبھی خوش تھے، سب تیاریاں کرنے میں لگے تھے۔ایک میں ہی تھی جو زندگی کا ماتم کر رہی تھی۔صرف میرے اندر غموں کی بارش ہو رہی تھی۔میرے ارمان جل رہے تھے۔میری دُنیا لٹ رہی تھی۔میرے سپنے بکھر رہے تھے۔میرا شہزادہ چھین لیا گیا تھا۔جو ہم سفر تھا کہیں کھو گیا تھا۔میں روتی رہی، ادھر شہنائی بجتی رہی۔میرے اندر آگ کا طوفان تھا، سہلیاں میرے اردگرد بیٹھی گیت گا رہی تھی۔

محلے والے حیران تھے کہ چند دنوں میں شادی، اتنی جلدی ہی کیا ہے۔؟نجانے کیا ماجرا ہے۔؟بات بھی سچ تھی سب کچھ چند دنوں میں ہی ہوا تھا۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی جلدی میری شادی ہو جائے گی

وہ بھی اس سے جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔واہ رے تقدیر۔۔مہندی کا دن بھی آ گیا۔مجھے مہندی احمد کے نام کی لگائی گئی۔یہ مہندی نہیں تھی میرے ارمانوں کا خون تھا۔میرے جذبات کا خاموش قتل تھا۔اُدھر احمد کے گھر والے مہندی لگا کر گئے ہی تھے کہ میں اُٹھی اور جا کر مہندی والے ہاتھ دھو دیئے۔میں تو صرف اور صرف ابرار کے نام کی مہندی لگانا چاہتی تھی۔وہی میرا ہم سفر تھا۔وہی میری زندگی کا ساتھی تھا۔اس کے لئے میری زندگی واقف تھی۔ساری سہلیاں گیت گا رہی تھی اور میں رو رہی تھی۔ایک ایک آنسو میرے من، میری روح کو زخمی کرتا جا رہا تھا۔روتے دھوتے وہ دن، وہ رات بھی گزر گئی۔دوسرا دن چڑھ گیا۔سورج میرے ارمانوں کو جلانے کے لئے بے تاب تھا، اسی دن تو بارات تھی لوگ گھر میں جمع ہونے لگے۔گھر کا صحن عورتوں لڑکیوں، معصوم بچوں سے سج گیا۔مختلف لباس میں ملبوس عورتیں، ڈانس کرتی لڑکیاں خوشی کا سماں پیش کر رہی تھی۔کہیں خوشیاں تھی تو کہیں ارمان جل رہے تھے۔ایک میرے اندر آگ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا باقی تمام خوشیاں منا رہے تھے۔میرے نگر میں اندھیرا تھا۔میرے گھر کو الیکٹرک لائٹوں سے روشن کیا گیا تھا۔میرے سپنوں کے چراغ تو کب کے بجھ گئے تھے اور یہاں چراغوں سے گھر کے در و دیوار سجا دیئے گئے تھے۔

شام کے سائے ڈھلتے ہی احمد سر پر سہرا سجائے، ڈھول کی تال کے ساتھ، باراتیوں کو لے کر ہمارے گھر آ گیا۔رقص کرتے اس کے دوست، بھنگڑے ڈالتے من چلے، خوشیاں منا رہے تھے۔شیروانی میں احمد مجھے ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔بارات کا استقبال کیا گیا۔کھانا کھلایا گیا۔پھر نکاح کی رسم ادا کی گئی۔رات گئے تاروں کی چھاؤں میں ایک بے جان جسم کو گاڑی میں ڈال کر لے جایا گیا۔احمد میرا سر تاج بن

گیا۔

ہائے کتنا بے بس ہوتا ہے وہ انسان جس کے ارمان جلے ہوں۔جس کے سپنے ٹوٹے ہوں، جس کی دُنیا ویران ہوئی ہو، جس کی مرضی کے بغیر فیصلے ہوئے ہوں۔ وہ تو جیتے جی مر جاتا ہے۔اس کا جسم تو ہوتا ہے روح نہیں ہوتی۔اس کی زبان پر قفل لگ جاتے ہیں۔اس کی آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں ،اس کا دل درد کی آہیں بھر رہا ہوتا ہے۔کاش ایک انسان دوسرے انسان کی جان نہ لیتا۔دوسرے کے ارمان نہ توڑے جاتے۔دوسروں کے دشمن نہ جلتے، دوسروں کی زندگیاں برباد نہ ہوتیں۔

کاش انسان ،انسان کا دشمن نہیں ،دوست ہوتا۔لیکن یہ دُنیا ہے یہاں لمحہ لمحہ زندگیاں ویران ہوتیں ہیں۔پل پل اذیت ملتی ہے۔یہاں خوشیاں دینے والے کم ،خوشیاں چھینے والے ہزاروں ہیں۔آنسو دینے والے قدم قدم پر ملتے ہیں۔آنسو صاف کرنے والے ،آنسو پونچھنے والے نجانے کس دیس بستے ہیں۔؟یہاں آنچلوں سے کھیلا جاتا ہے،آنچل سروں پر ڈالنے والے نہیں ہیں۔یہاں آبرو برباد کی جاتیں ہیں،عزتیں نیلام ہوتیں ہیں۔آبرو کے رکھوالے نہیں ہیں۔

اس دُنیا میں انسان کے روپ میں سانپ بستے ہیں۔جن کو جتنا دودھ بھی پلایا جائے ،ڈستے ضرور ہیں۔اس کی فطرت میں ڈسنا ہے۔زندگیاں برباد کرنا ہے۔یہ انسان اُس ماں کو معاف نہیں کرتا جو دودھ پلاتی ہے باقی رشتوں کی حفاظت کیا کرے گا۔رشتوں کی پامالی کر کے جھوٹی خوشیاں، جھوٹی دولت حاصل کرتا ہے۔اے میرے ربّ تو یہ انسان اس دُنیا میں نہ ہی بھیجتا تو تیرا کیا جاتا۔؟تیرے خزانے میں کیا کمی تھی۔۔؟تیری عبادت کو فرشتے ہی کافی تھے پھر تو نے یہ کارواں کس لئے چلایا۔۔؟

احمد راولپنڈی میں رہائش پذیر تھا۔عرصہ ہوا تھا ہمارے گھر سے گئے ہوئے۔وہی پر کام کرتا تھا۔رات گئے دولہا بارات کے ہمراہ بے جان دولہن کو لے کر پنڈی پہنچ گیا۔احمد کے گھر میری خوب آؤ بھگت کی گئی۔ڈھول پر بھنگڑے ڈالے گئے۔آتش بازی ہوتی رہی۔اسلحے کی نمائش، فائرنگ ہوتی رہی۔شہنائیاں گونجتی رہی۔میں بت بنی حجرہ عروسی میں بیٹھی اپنی بے بسی کا ماتم کررہی تھی۔رات گئے لوگوں کا شور ہلہ گلہ کم ہوا ،دھیرے دھیرے سبھی محوِ خواب ہونے لگے۔احمد دوستوں سے فراغت پا کر حجرہ عروسی میں آیا۔میرے پاس سہلیاں بیٹھی تھیں۔احمد کو دیکھتے ہی، مسکراتی، ہنستی اٹھ کر چلی گئیں۔احمد میرے پاس آ بیٹھا، میرا گھونگھٹ اٹھایا۔میں سر جھکائے آنسوؤں میں نہا رہی تھی۔اس نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا میں نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

عندلیب!میں تمھیں گولڈ کی انگوٹھی پہننا چاہتا ہوں۔میں نہیں پہنوں گی۔

عندلیب!اب تم میری بیوی بن گئی ہو۔ابرار کو سپنا سمجھ کر بھول جاؤ۔بس ایک سپنا تھا جو ٹوٹ گیا۔میں تمھیں ہر خوشی دوں گا۔

نہیں احمد!یہ تمھاری بھول ہے۔سپنا ٹوٹا نہیں وہی میرا شہزادہ ہے۔میں نے تمھیں پہلے بتا دیا تھا، میں تمھاری نہیں ہوں۔نہ ہی تمھاری بن سکتی ہوں۔میرے جسم وروح کے مالک تم نہیں ،ابرار ہے۔

احمد ڈھیٹ تھا ٹس سے مس نہ ہوا ،میرے جسم کو چھونا چاہا۔میں نے سختی سے منع کر دیا، پھر وہ رات دردناک عذابوں میں گزرتی ہی گئی۔احمد

دوسرے بیڈ پر سو گیا اور میں آنسو بہاتی وہی پر سو گئی۔ وہ رات بھی ہزاروں غموں کی سوغات دے کر گزر گئی۔ جس کا انتظار ہر لڑکی بڑا کا کرتا ہے۔ سہاگ رات کا خواب ہر کوئی دیکھتا ہے۔ زہریلی ناگن جیسی یہ رات بھی ہزاروں آنسو میرے نام کر گئی۔

صبح سویرے سہلیاں آ کر مذاق کرنے لگی۔ رات بھر کیا ہوا۔۔ ارے دیکھو، دیکھواس کی تو آنکھیں سُرخ لال ہو گئیں ہیں۔ احمد نے رات بھر اپنی میٹھی شیریں باتیں سنائی ہو گی۔ تبھی تو سو نہیں سکی بیچاری۔ خوب سپنوں کے محل تعمیر کیے ہو گے۔ اب انھیں کیا جواب دیتی۔۔؟ بھلا کسی کی زبان کو کوئی روک پایا ہے، جو میں روکتی۔

احمد بھی صبح سویرے اٹھ کر دوستوں کی محفل میں مصروف ہو گیا۔ ہم نے غسل نہیں کیا تھا۔ جب غسل واجب ہوتا تو کرتے۔ شاید یہی بات میرے اور احمد کے گھر والوں نے محسوس بھی کی ہوگی۔ لیکن وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کسی نے بات نہ کی۔

ولیمہ ہوا لوگ آئے پیٹ کی آگ بجھائی، باتیں سنتے، سناتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے ایک کے سپنے ٹوٹے، ایک کے سہرے سجے۔ وقت کا کام ہے گزرنا، سو بےرحم وقت گزرتا رہا۔

اسی طرح شادی کو آٹھ دن گزر گئے۔ آٹھویں روز احمد نے میرے جسم کو حاصل کر لیا۔ لیکن میری روح، میری محبت، میری چاہت، میری آرزو، صرف ابرار تھا۔

دستورِ زمانہ ہے عورت ظلم سہتی آئی ہے۔ بیچاری کمزور عورت کر بھی کیا سکتی ہے۔ مرد، مرتا ہی عورت کے شباب پر ہے۔ اس رات احمد وحشی بن گیا۔ مجھ پر تشدد کیا۔ مجھے مارنے لگا، گالیاں دی، میں روتی رہی، سسکتی رہی، تڑپتی رہی اور وہ میرے جسم سے کھیلتا رہا۔

احمد نے میرا جسم تو حاصل کر لیا تھا۔ مگر من میں جگہ نہ بنا سکا۔ میں طلاق مانگنے لگی۔ احمد تھا کہ بار بار ابرار کا نام لے کر طعنے دیتا۔ بُھول جاؤ اس کمینہ کو ورنہ اس کے ساتھ تمھیں بھی قتل کر دوں گا۔ ضد اور انا کی جنگ میں دونوں جلتے رہے۔ وقت محوِ پرواز رہا۔ میں ابرار کو نہ بُھول سکی اور احمد بھی دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہا۔ شادی کو ایک ماہ گزرا تھا کہ چھوٹے چُھوٹے جھگڑے طول پکڑنے لگے۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح بات طول پکڑے اور مجھے طلاق مل جائے۔ پھر میں اپنے محبوب کو پا لوں۔ شاید میں پہلی عورت تھی جو خود ہی طلاق کی طلب گار تھی۔ جو اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو آگ لگانا چاہتی تھی۔

احمد بضد تھا کہ میں تمھیں اس بندھن کی زنجیروں میں قید رکھوں گا۔ پل، پل اذیت دوں گا۔ چاہے جو ہو جائے، تمھیں آزاد ہرگز نہیں کروں گا۔

میں نے خالہ کو کہا اپنا وعدہ نبھاؤ۔ میں احمد کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ بس مجھے طلاق چاہیے، صرف طلاق۔ خالہ مجھے سمجھانے لگی۔

دیکھو عندلیب! ہوش کے ناخن لو۔ تھوڑا عرصہ ہوا ہے تمھاری شادی کو اور تم طلاق مانگنے لگی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا؟ برادری کیچڑ اُچھالے گی۔ اپنی اور ہماری عزت کا کچھ تو خیال کرو۔ ہماری عزت خاک میں نہ ملاؤ۔ کم از کم ایک سال خاموشی سے گزارو۔ خالہ کا خیال تھا وقت کے ساتھ میں سمجھوتہ کر لوگی، مگر یہ خالہ کی بھول تھی۔

احمد اور میری نہ بن سکی۔خالہ تو چاہتی تھی کہ ہم دونوں میں محبت پیدا ہو جائے لیکن جس کی بنیاد ہی نفرت سے رکھی گئی ہو وہاں محبت کا کیا کام۔ احمد کوشش کرتا رہا لیکن میں بھی مجبور تھی۔عشق کا بُھوت جو سوار تھا۔میں نے ابرار کے ساتھ وعدے کیے تھے۔قسمیں کھائی تھیں،ابرار پر مر مٹی تھی۔وہی میری منزل تھی بس یہی میری سب سے بڑی بُھول تھی۔میں ہی غلط تھی۔احمد اذیت دیتا رہا۔میں روز روز کی مار کھا کھا کر ڈھیٹ ہوگئی۔پھر ابرار سے رابطہ کرلیا۔ہماری بات ہونے لگی۔ابرار بھی یہی چاہتا تھا کہ میں احمد سے طلاق لے لوں اور ہمیشہ کے لئے اس کی ہم سفر بن جاؤں۔

ابرار کہتا،میں تمھیں اپنا لوں گا،زمانے کی ساری خوشیاں تمھارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔ایک طرف احمد میرا شوہر تھا تو دوسری طرف میرا پیار ابرار۔میں کس کا ساتھ دیتی۔؟کس کو چھوڑتی۔؟فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔احمد میرے پیار کے لئے ترس رہا تھا اور میں ابرار کیلئے ترس رہی تھی۔

عجیب زندگی تھی میری،کوئی مجھے چاہتا تھا اور میری چاہت کوئی اور تھی۔یہ چاہنا اور چاہے جانا کتنا عجیب کھیل ہے۔احمد نے ہزار ہا کوشش کی مگر بات نہ بن پائی۔میں اپنی ضد پر قائم رہی اور احمد مجھ سے ناراض ہو کر بیرون ملک چلا گیا۔احمد کا بیرون ملک جانا تھا۔میں روز ابرار سے باتیں کرنے لگی۔احمد نے جاتے ہوئے ایک ظلم اور کیا۔میرے ماما،پاپا کو سب کچھ بتا دیا کہ عندلیب طلاق لینا چاہتی ہے۔مگر میں اسے زندگی بھر طلاق نہیں دوں گا،دوسری شادی کرلوں گا۔جس طرح میں تڑپا ہوں عندلیب کو بھی تڑپاؤں گا۔

احمد چلا گیا۔ماما پاپا مجھے سمجھاتے رہے۔عندلیب!تم پاگل ہو۔سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔شادی شدہ عورت کو کوئی نہیں اپناتا۔اور تو اور طلاق شدہ عورت زمانے میں بدنام ہو کر رہ جاتی ہے۔لوگ اسے بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔اسے ذلیل وخوار ہونا پڑتا ہے۔تم بکھر جاؤ گی،تم برباد ہو جاؤ گی۔ہماری بات مان لو،ہم نے تمھیں پالا ہے۔تمھارا بُرا نہیں چاہتے۔کچھ ہماری عزت کا خیال کرو۔کون سی کسر ہم سے رہ گئی تھی۔جس کی اتنی بڑی سزا دے رہی ہو۔ہماری بات مان لو۔احمد بُرا نہیں ہے۔جانتی ہو آج کے مرد سانپوں سے بھی زیادہ زہریلے ہیں۔ڈستے ہیں ان کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگ سکتا۔شکر کرو احمد ان میں سے نہیں ہے۔اپنا ہے،خاندان سے ہے۔اس کے پاس سب کچھ ہے۔اللہ نہ کرے کل کو اس نے کسی اور کو اپنا لیا تو تم پچھتاوے کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔بکھر و گی تو کوئی تمھیں سہارا نہیں دے گا۔زمانہ تمھیں جینے نہیں دے گا۔ہم آج نہیں تو کل اس دُنیا سے چلے جائیں گے۔پھر کوئی تمھارا نہیں ہوگا۔آج تم جس کے لئے دیوانی ہو،کل تمھیں ہزاروں غم دے کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو جائے گا۔مرد کی فطرت میں شامل ہے۔یہ تو ہر کلی کی خوشبو لینا چاہتا ہے۔ہر پھول کو مٹھی میں مسلنا چاہتا ہے۔بھنور کی طرح ہر پُھول،ہر کلی،ہر گلشن میں آوارگی کرتا ہے۔کوئی سچا پیار نہیں کرتا۔سب ہوس کے غلام ہیں۔سب جسموں کے پوجاری ہیں۔تم تو پھر اجڑی ہوئی بے سہارا عورت ہوگی۔کون تمھیں اپنا بنائے گا۔ہماری بات مان لو بیٹی۔ہماری بات مان لو۔

ماما پاپا کی باتیں ابھی تک میری کھوپڑی میں نہیں بیٹھ رہی تھیں۔وہ ٹھیک کہتے تھے لیکن میں کیا کرتی۔۔؟ابرار کے پیار میں پاگل تھی۔اس نے نجانے کیسا جادو کر دیا تھا۔؟میری منزل صرف اور صرف ابرار ہی تھا۔مجھے یقین تھا مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔میرا سہارا بنے گا۔میں اسی

کے گن گاتی رہی زمانے والے چاہے جو مرضی کہتے رہیں مجھے پروا نہیں تھی۔ میرا شہزادہ وہی تھا۔ وہ بھی ابھی تک میرا ساتھ دے رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کب کا راہیں بدل چکا ہوتا۔ تبھی تو مجھے اعتبار تھا کہ وہ مجھ سے سچا پیار کرتا ہے۔ مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔

دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ زندگی کی گاڑی ہچکولے کھاتی رہی۔ اسی طرح دو سال بیت گئے۔ شادی کے بعد بھی ابرار سے متواتر رابطہ رہا۔ بات ہوتی رہتی تھی۔ پھر اچانک نجانے کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابرار کا نمبر آف ہو گیا۔ میں روز ٹرائی کرتی مگر نمبر پاور آف ہی ملتا۔ میں پریشان بھی تھی اللہ خیر کرے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی پرابلم ہوتی تو مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ اللہ! خیر کرے۔

ابرار کا ایڈریس میرے پاس تھا لیکن گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ گھر والوں کی نظریں میرا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ یہ راز تو بعد میں عیاں ہوا۔ میری خالہ ہی میری رقیب بن گئی تھی۔ اس نے ہی ابرار کو کال کی۔

دیکھو ابرار! عندلیب کو بُھول جاؤ۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ اب اس کی زندگی سے دُور بہت دُور چلے جاؤ۔ اس کے آنگن کو برباد مت کرو۔ پیار کرنے والے محبوب کو اذیت نہیں دیتے۔ تمہیں کوئی اور اچھی لڑکی مل جائے گی۔ عندلیب کا پیچھا چھوڑ دو۔

خالہ نے ابرار کا نمبر احمد کو دے دیا۔ احمد نے نمبر ماما پاپا کو دے دیا۔ سبھی نے اپنی اپنی جگہ اسے دھمکیاں دی، اسے ڈرایا۔ تمہیں ختم کر دیں گے ساتھ میں عندلیب کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔ زندگی کی سلامتی چاہتے ہو تو عندلیب کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤ۔ تب سے ابرار نے نمبر بدل لیا تھا۔

بزدل تھا ڈر گیا۔ پیار کرنے والے ڈرتے تھوڑے ہیں۔ وہ مرد ہو کر بھی بزدل نکلا اور میں عورت ذات ہو کر مقابلہ کر رہی تھی۔ خیر میں وہ جگہ جانتی تھی جہاں ابرار کام کرتا تھا۔ میں اُسے تلاش کر سکتی تھی۔ ایک ہی شہر میں تو رہتے تھے۔

ابھی اِسی حالات میں زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے کہ احمد وطن واپس آ گیا۔ نجانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ اب کی بار اس کے تیور کچھ زیادہ بدلے ہوئے تھے۔ اُسے میری ضرورت نہیں تھی۔ بیرون ملک نجانے ہزاروں زندگیوں سے کھیلتا رہا ہو گا۔ جسموں سے ہوس کی پیاس بجھاتا رہا ہو گا۔ گوری رنگت والیوں کو کیا خبر، عزت، آبرو کیا ہوتی ہے۔ مغربی کلچر میں عزت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہاں پل میں یار بدلتے ہیں، شادی کسی سے، اولاد کسی اور کی ہوتی ہے۔ وہ صرف انجوائے کرتے ہیں۔ وہاں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

احمد بھی وہاں رہ کر آیا تھا۔ اب اسے میری ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی انا کی جنگ میں جھلس رہا تھا۔ مجھے آزاد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، میرا ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو مجھے سزا دینی تھی۔ جس کی پوری پوری تیاری کر رکھی تھی۔ میری زندگی ویران کھنڈرات جیسی بنا دی۔ روز اذیت دیتا، روز مارتا تھا۔

ماما پاپا بھی اسی کے گن گاتے تھے۔ اسی کی بات مانی جاتی تھی۔ جب میں نے ہی ماں باپ کی نہیں مانی تھی وہ میرا اعتبار کیسے کرتے۔ سو میں اکیلی تنہا ہو کر رہ گئی۔ مجھے اپنوں نے برباد کر دیا۔ میری خوشیاں، غموں میں بدلنے والے میرے اپنے ہی تو تھے۔

پھر ایک دن وہ ہوا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ باتوں باتوں میں احمد اور میرا جھگڑا طول پکڑ گیا۔ احمد وحشیوں کی طرح مجھے مارنے

لگا۔ پھر ایک عورت بغاوت پر اُتر آئی۔ اپنوں کی عزت آبرو پس پردہ ڈال کر گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ میری منزل صرف اور صرف ابرار ہی تھا۔ میں نے اسے تلاش کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا وہی ایک سہارا ہے جو مجھے اپنا لے گا۔ بس اسے تلاش کرنا تھا۔

میں گھر سے راولپنڈی اڈے کی طرف محوِ سفر ہوئی۔ لاری اڈے پر پہنچ کر ابرار کی فیکٹری کی طرف روانہ ہوئی۔ مجھے یقین تھا وہ ابھی بھی وہی کام کرتا ہوگا۔ جب وہاں پہنچی تو واقعی ابرار وہی کام کرتا تھا۔ اس وقت ابرار وہاں موجود نہیں تھا۔ وہاں سے اس کا نیو نمبر حاصل کر کے کال کی۔ میں نے بھی نیو نمبر سے کال کی۔ تا کہ ابرار کو پہلے معلوم نہ ہو۔ ابرار نے فوراً کال ریسیو کی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اچانک عندلیب کال کر سکتی ہے۔ ہیلو ابرار، میں، میں عندلیب بات کر رہی ہوں۔ میری بات دھیان سے سنو۔ میں سب کچھ چھوڑ کر سب حدیں پھلانگ کر تمھاری ہونے آئی ہوں۔ مجھے لے جاؤ۔

ابرار حیران تو ہوا مگر میری دھمکی کام کر گئی کہ اگر تم نہ آئے تو میں ابھی جان دے دوں گی اور نام تمھارا کر دوں گی۔ میری موت کے ذمہ دار تم ہو گے۔

عندلیب پاگل مت بنو۔ تم ہو کہاں۔۔؟

میں نے اسے جگہ بتائی۔

اوکے تم وہاں ٹھہرو میں آتا ہوں۔

میں پریشانی کے عالم میں انتظار کی سولی پر لٹکی ابرار کی راہیں تک رہی تھیں۔ نجانے ابرار مجھے اپنائے گا بھی کہ نہیں۔ سوچوں کی وادی میں گم تھی کہ ابرار بائیک لے کر میری نظروں کے سامنے تھا۔ نظروں کی پیاس بجھی، دیدار یار ہوا۔ ابرار تم نے نمبر تبدیل کیوں کر لیا تھا۔ بس یار تمھارے گھر والوں نے مجھے بہت دھمکیاں دی۔ پھر اس نے ساری کہانی میری سماعتوں کی نذر کی۔ جو میں پہلے بیان کر چکی ہوں۔

ابرار مجھے ہوٹل لے گیا۔ وہاں سے کھانا کھایا۔ ابرار جلدی سے مجھ سے نکاح کر لو۔ میں تمھاری ہونا چاہتی ہوں لیکن ابرار آمادہ نہیں تھا۔ شریعت اس کام کی اجازت نہیں دیتی۔ میں کسی کی بیوی تھی۔ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا تھا، ایسا کرنا حرام تھا۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ابرار کہنے لگا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پہلے تم احمد سے طلاق لے لو پھر میں تمھیں اپنا لوں گا۔ اس کیلئے لمبا انتظار کرنا پڑتا۔ عدالت سے رجوع کرتی تب بھی مہینے لگ جاتے۔ لیکن میں تو گھر سے روٹھ کر آئی تھی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی تھی۔

میں رونے لگی۔ ابرار تسلیاں دینے لگا۔ اچھا عندلیب! چلو گھر چلتے ہیں۔ میں اپنے گھر والوں سے ملواتا ہوں پھر کوئی راہ نکالتے ہیں۔

ابرار کی ایک بہن اور اس کی ماں گھر پر تھی۔ جو کہ ابرار نے بتایا تھا۔ والد اس کا بہت پہلے فوت ہو چکا تھا۔ گھر کا واحد کفیل ابرار ہی تھا۔ ایک بہن کی شادی ہو گئی تھی۔

میں راضی ہو گئی۔ ابرار مجھے ایک عمارت کے سامنے کھڑا کر کے اندر چلا گیا۔

عندلیب! تم رکو!۔ میں ابھی آتا ہوں۔

مجھے شک سا ہوا۔جیسے کوئی گڑبڑ ہے۔کچھ ہونے والا ہو۔دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو رّد کر دیا کہ ابرار میرے ساتھ کبھی دھوکہ نہیں کر سکتا۔لیکن کیا خبر تھی۔موسم کی طرح انسان بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔چند لمحوں کے بعد ابرار واپس آ گیا۔

آؤ عندلیب!اندر آؤ۔میں اندر چلی گئی۔تین منزلہ گھر تھا۔ابرار مجھے سیکنڈ فلور پر لے گیا۔مجھے بیٹھایا۔

عندلیب!تم بیٹھو،میں امی کو بلا کر آتا ہوں۔ابرار چلا گیا ،میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔خوبصورت بیڈ سجا ہوا تھا۔دیواروں پر خوبصورت،دلکش تصویریں آویزاں تھیں۔گھڑی کی ٹک ٹک ماحول میں شور برپا کرنے میں مشغول تھی۔ابھی میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ابرار ہاتھوں میں مشروب لیے نمودار ہوا۔لو عندلیب!ڈرنک پیو۔

ابرار!ابھی تو پی کر آئے ہیں۔

کوئی بات نہیں پانی ہی تو ہے۔امی سو رہی ہیں جیسے اُٹھتی ہیں آپ سے ملواتا ہوں۔

باتیں کرتا ابرار میرے ساتھ بیڈ پر آ بیٹھا۔میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہی پیار بھری باتیں کرنے لگا۔باتوں،باتوں میں میرے قریب ہوتا گیا۔میں پریشان ہو گئی۔اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ابرار کے منہ سے بدبُو آ رہی تھی جیسے شراب پی رکھی ہو۔اس کے ارادوں سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔شیطانیت اس پر حاوی تھی۔

عندلیب!کل کو تم میری بیوی ہی بنو گی۔تمھارے جسم پر میرا ہی حق ہے۔مجھے پاس آنے دو۔میں تمھیں اپنا مانتا ہوں۔میرے دل کی پیاس بجھا دو۔

شرم نہیں آتی ابرار!تم کیا کہہ رہے ہو۔۔؟تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے۔عورت کے لئے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔میں اپنی عزت کو داغدار نہیں کرنا چاہتی۔دور ہو جاؤ میں غصے میں لال پیلی ہو گئی۔

ابرار نشے میں تھا۔ابرار آگے بڑھنے لگا تو میں نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ابرار گال پر ہاتھ رکھے میرے بدلتے تیور دیکھ رہا تھا۔میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ابرار زبردستی پر اُتر آیا۔شکر اللہ کا ٹیبل پر گلدان پڑا تھا جو میرے ہاتھ میں آ گیا۔وہی گلدان دوسرے لمحے ابرار کے سر پر پڑ چکا تھا۔اور میں بھاگ کھڑی ہوئی۔اللہ تعالٰی نے میری عزت بچالی تھی۔ابرار دھوکے باز نکلا۔پیار کا ڈھونگ رچانے والا اصل میں شیطان بن گیا تھا۔شیطانیت اس پر حاوی تھی۔بے بس،تنہا عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔میں مجبور ضرور تھی۔گھر سے ظلم و ستم سہتی فرار ہوئی تھی۔مگر عزت کی پاسداری کر سکتی تھی۔

رب تعالٰی عزتوں کا رکھوالا بھی ہے۔شاید کبھی جانے انجانے میں کوئی نیکی کی تھی جو آج کام آ گئی تھی۔رب تعالٰی کتنا بے نیاز ہے۔وہ اپنے بندے سے کتنی محبت کرتا ہے۔مگر اس کے بندے اُف توبہ۔۔۔۔جو رب ماں سے بھی ستر گنا بڑھ کر پیار کرنے والا ہے،اس کے احکام نہیں مانتے۔میری آنکھیں سمندر میں غوطہ زن تھیں۔اشکوں کی برسات چھم چھم برس رہی تھی۔دل پر لگا زنگ،نمکین پانی کے قطروں سے اُتر رہا تھا۔آج اللہ تعالٰی کے عذاب سے خوف اور اس کی رحمتوں کا شکر کرنا یاد آ رہا تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ایڈ فری لنکس
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



ماما پاپا گھر والوں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔میں ہی غلط تھی جو ایک سراب کے پیچھے بھاگتی رہی۔شیطانی روپ میں ایک انسان سے سچا پیار کرتی رہی۔جو انسان نہیں درندہ تھا۔عزتوں کا درندہ۔وہ تو میرے جسم کا خواہاں تھا۔اس کا پیار مطلبی تھا۔میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا۔پردے کے پیچھے چھپی تصویر صاف و شفاف عیاں تھی۔حقیقت عیاں ہوگئی تھی۔میں حقیقت کو دیکھ چکی تھی۔مطلبی پیار سے نجات پا کر حقیقی رشتوں کی طرف چل پڑی۔

درندے کے جال سے نکلتے ہی ہانپتے ہوئے خالہ کو فون کیا۔خالہ میں راولپنڈی میں ہوں آپ کے پاس آنا ہے۔خالہ حیران تھی۔یوں اچانک خیر تو ہے۔مجھ سے پوچھا۔

عندلیب! کہاں ہو۔؟

میں نے ایڈریس بتایا تو خالہ کہنے لگی یہاں سے ٹیکسی لے کر فلاں جگہ پر آجاؤں۔میں نے مطلوبہ گاڑی پکڑی اور خالہ کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ابھی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی کی ابرار کی کال آنے لگی۔میری آنکھیں سُرخ لال ہورہی تھی۔میں نے کال کنسیل کردی۔وہ بار بار کال کرتا رہا۔میں کنیسل کرتی رہی۔پھر اس نے مسیج کیا۔

پلیز عندلیب!ایک بار صرف ایک بار کال سن لو۔

پھر نا چاہتے ہوئے بھی میں نے کال اوکے کرلی۔وہ بولتا رہا،میں خاموش بت بنی سنتی رہی۔آنکھیں بہہ رہی تھی۔عندلیب!اللہ کے لئے مجھے معاف کردو۔میں بہک گیا تھا۔مجھے ہوش نہیں راہ تھا۔میں شیطانی بہکاوے میں آگیا تھا۔اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔میرا یقین کرو۔مجھے معاف کردو۔واپس آجاؤ۔کہاں جاؤ گی،کون سہارا دے گا۔۔؟

اللہ کی دُنیا بہت بڑی ہے کہیں نہ کہیں چھت مل ہی جائے گی۔ابرار پیار کے رشتے اعتبار کے دھاگے سے بندھے ہوتے ہیں۔جب شک کی ڈاریں پڑ جائیں تو رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔مضبوط سے مضبوط رشتے بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔تم نے پیار صرف میرا جسم حاصل کرنے کیلئے کیا تھا۔مجھے آباد کرنے کی بجائے،برباد کرنا چاہتے تھے۔مجھے اپنی ہی نظروں میں گرانا چاہتے تھے۔ایک میں ہی پاگل تھی جو اندھا اعتبار کرتی رہی۔میرا رب میرے ساتھ ہے میری عزت وآبرو کا وہی رکھوالا ہے اب مجھے کسی کا سہارا نہیں چاہیے۔مجھے انسان سے نفرت ہے،پیار سے نفرت ہے۔مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

میری باتیں ٹیکسی ڈرائیور سن رہا تھا۔جب میں نے کال کاٹ دی تو ڈرائیور مجھ سے مخاطب ہوا۔میڈم!میں نے آپ کی تمام گفتگو سن لی ہے۔کیا میرے ساتھ رہو گی۔مجھے خوش کردو میں تمھیں نوٹوں سے خوش کردوں گا۔

گاڑی رکو کمینے۔ڈرائیور کی باتیں سنتے ہی میں غصے میں لال پیلی ہوگئی۔تمھارے گھر میں ماں،بہن بیٹی نہیں ہے۔اپنی ماں،بہن،بیٹی کو کہنا آپ کو خوش کریں گی۔شیطان،کمینے،سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔شباب کے بھوکے،اپنی عزتوں کے رکھوالے،دوسروں کی عزتیں نیلام کرنے والے۔

مرد ہی عزت نیلام کرتا ہے اور عزتوں کا رکھوالا بھی ہے۔اب عورت ذات کیسے پہچان کرے۔۔؟کون سا مرد نیک ہے اور کون سا شیطان۔غصے میں نجانے ڈرائیور کو کیا کچھ کہتی گئی۔میں نے گاڑی رکوادی۔اس سے پہلے کہ ڈرائیور کوئی حرکت کرتا۔میں نے شور کرنا شروع کر دیا۔گاڑی رکی ہی تھی کہ میں دروازہ کھولتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔اردگرد کے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔انہوں نے ڈرائیور کو پکڑ لیا۔وہ اسے مار رہے تھے۔میں تو وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ڈرائیور کو تو سزا مل گئی تھی۔

میں نے خالہ کو فون کیا۔روہانسی آواز میں کہا خالہ مجھے لے جاؤ نہیں تو یہ درندے مجھے مار دیں گے۔میری جان تم ہو کہاں۔۔؟میں نے خالہ کو جگہ بتائی۔خالہ کا گھر قریب ہی تھا۔فوراً خالہ وہاں آ گئی اور یوں شیطانوں کی نگری سے نجات پا کر محفوظ جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ڈنیا سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔مردوں سے اعتبار اٹھ گیا۔خالہ کے گلے لگ کر خوب آنسو بہائے۔خوب دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکلا۔من صاف ہو گیا۔میری آنکھیں کھل گئی۔میں رو رہی تھی خالہ مجھے دلاسے دے رہی تھی۔پھر میں نے خالہ کو سبھی کہانی سنادی۔کیسے احمد سے جھگڑا ہوا۔کیسے وہاں سے نکلی۔؟کیا ہوا۔؟سب کچھ بتادیا۔

عندلیب!اللہ کا شکر ادا کرو۔ابھی کچھ نہیں بگڑا۔صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔حقیقت تم پر عیاں ہوگئی اب سنبھل جاؤ۔قریبی رشتے داروں کو خالہ نے یہی بتایا کی عندلیب مجھے ملنے آئی ہے۔گھر والوں کو بھی یہی یقین تھا کی عندلیب غصے میں گھر سے نکلی ہے اپنی خالہ کے ہاں ہی گئی ہوگی۔

شام کو خالہ نے احمد کو فون کر کے بلوالیا۔خالہ نے اسے سمجھایا۔

دیکھو احمد!عندلیب اب بدل گئی ہے۔وہ تمھیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرے گی۔تم بھی محبت سے پیش آیا کرو۔خالہ نے احمد کو سمجھایا پھر سورج غروب ہوتے ہی احمد مجھے لے کر گھر آ گیا۔میں خوش ہو رہی تھی کہ احمد مجھے خوش رکھے گا۔رات کو جب میرے پاس آئے گا،میں اس کے قدموں میں گر جاؤں گا اور اپنے کیے کی معافی مانگ لوں گی۔باقی کی عمر خدمت کروں گی۔لیکن ایسی رات کبھی آئی بھی نہیں،میں احمد سے معافی کیسے مانگتی۔؟اسی رات احمد نے اپنے گھر والوں کو کہہ دیا۔عندلیب کو کہہ دو۔میرے ساتھ دُوبئی چلے۔یا اپنے گھر چلی جائے۔میں دُوبئی نہیں جانا چاہتی تھی۔نجانے وہاں احمد میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔۔؟یہاں ماما پاپا،خالہ تو ہیں،وہاں احمد کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔میں کہاں جاؤں گی۔؟احمد بھی اپنی انا پر قائم رہا اور میں اپنی ضد پر قائم رہی۔پھر احمد ہمیشہ کے لئے دُوبئی چلا گیا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ڈاکٹروں سے چیک اپ کروایا تو انھوں نے خوش خبری دی کہ آپ ماں بننے والی ہیں۔میں خوش ہوئی کہ میری گود ہری ہوگئی۔احمد کو پتہ لگے گا تو خوش ہوگا۔مجھے معاف کر دے گا۔مگر ایسا نہیں ہوا۔اور وہ دن بھی آ گیا جب ڈلیوری ہوئی۔بڑے آپریشن سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا عطا کیا تھا۔بالکل احمد کے نین نقش تھے۔احمد بیٹے کی پیدائش پر بھی وطن واپس نہ آیا۔میں احمد کی نشانی کو دل و جان سے محبت کرتی،اس کو سینے سے لگاتی۔مگر شاید خوشیاں میرے نصیب میں نہیں تھیں۔قسمت کی دیوی مجھ سے ناراض تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ نے احمد کی نشانی کو اپنے پاس بلوالیا۔میں پھر تنہا ہوگئی۔میری گود اجڑ گئی۔غموں نے مجھے چکنا چور کر

دیا۔اب سوائے آنسوؤں کے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔تنہا زندگی، مسلسل عذاب میں تھی آہیں تھیں اور یہ بے بس زندگی تھی۔

ابرار کب کا میری زندگی سے جا چکا تھا۔اس نے اپنی دُنیا بسالی تھی۔اپنی بیوی کے ساتھ خوش تھا میرے چلے جانے کے بعد اس نے شادی رچالی تھی۔سننے میں آیا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے دو بچیوں سے نوازہ ہے۔وہ اپنی دُنیا میں خوش ہے۔نجانے ایک لڑکی کا دل توڑ کر دوسری لڑکی کو کیسے خوش رکھتا ہوگا۔۔؟جو اپنے پیار کو داغدار کرنا چاہتا تھا۔اپنے گھر کی عزت کا خیال کیسے رکھتا ہوگا۔عورت سے جسمانی تسکین چاہنے والا ،محبت کیسے کرتا ہوگا۔؟شاید بے مروت مرد ہوتے ہے ایسے ہیں۔اپنی میٹھی شیریں باتوں سے معصوم کلیوں کی زندگیاں برباد کرتے ہیں۔وقتی تسکین کے لئے عمر بھر کے پیار کو ترستے ہوں گے جسم کے خواہش مند کبھی پیار نہیں کرسکتے اور نہ ہی پیار پاسکتے ہیں۔شاید ابرار بھی انہی میں سے ایک تھا۔

میری بُھول تھی کہ اپنے والدین ،اپنے شوہر کو چھوڑ کر صرف اور صرف ایک بے وفا ،بے حس انسان کو چاہا تھا۔جو پیار کے جذبے سے آشنا نہ تھا۔جو پیار کے مطلب سے ناواقف تھا۔شاید دُنیا میں سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔رب سے محبوب کے طلب گار تو ہیں رب تعالیٰ کے عظیم تحفے کی قدر نہیں کرپاتے۔اِسے بازاروں میں نیلام کردیا۔اِسے محفلوں کی رونق بنادیا۔اِسے گھر کی رونق کی بجائے ،نمائشی بنادیا۔حیرت ہے ایسے مردوں پر جو اپنے ربّ سے اپنی تنہائی کے خاتمہ کے لئے ،دلی سکون کے لئے ربّ سے محبوب ،ساتھی طلب کرتے ہیں۔لیکن رب کے عطا کردہ محبوب کی قدر نہیں کرتے۔جو،ان کے گھروں کو سنوارتی ہیں ان کی زندگی برباد کردیتے ہیں۔اس کا حق کھا جاتے ہیں۔اس کی جائیدادیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔نفرت ہے نفرت ہے مجھے ایسے مردوں سے۔

احمد نا جانے کس خطا،کس ستم کی سزا دے رہا ہے۔مجھے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا ،میرا ہونا بھی نہیں چاہتا۔اس بے درد دُنیا میں ،میں گھٹ گھٹ کے جی رہی ہوں ،اب تو بس موت ہی مجھے سکون دے گی۔ورنہ یہ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہلوانے والے ،اپنے ہم منصب کی زندگی برباد کرتے رہے گے۔

میں مرنا چاہتی ہوں ،اس بے درد دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔۔؟میرا ہے ہی کون۔؟جس کا انتظار کروں۔جس کیلئے زندگی مانگوں۔میری گود اجڑ گئی۔میرا پیار مطلبی نکلا۔میرا شوہر دُنیا کی رنگینوں میں کھو گیا۔میں آج بھی احمد کا انتظار کررہی ہوں کاش احمد واپس آجائے۔میں اس سے معافی مانگ سکوں ،پھر چاہے موت آجائے ،کوئی غم نہیں۔ہاں احمد ایک بار مجھے معاف کردوں ،مجھے اپنی ہم سفر مان لو۔صرف میرے ہو جاؤ۔میں آپ کی خدمت کرسکوں تاکہ میرا ربّ مجھے معاف کردے۔اور آخرت میں نجات حاصل کرسکوں ،احمد !اللہ کے لئے واپس آجاؤ مجھے معاف کردو۔

ابھی میں اپنے ربّ سے دعا مانگ کر مصلےٰ سے اُٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔دروازہ کھولا تو میرا سرتاج لبوں پہ مسکراہٹ سجائے بازوں پھیلائے کھڑا تھا۔اور میں اس کے قدموں میں گر گئی ،احمد نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔میری زندگی میں بہاریں لوٹ آئی تھیں.......مجھے میرا سچا ہم سفر مل گیا تھا......(ختم شد)۔

☆------☆------☆


کیا یہ محبت ہے؟

کیا یہ محبت ہے؟

تحریر: عارف شہزاد.....صادق آباد

0315-6736148

کبھی کبھی بہت جی چاہتا ہے آپ کو اماں کہہ کر پکاروں آپ بالکل اماں کا روپ دھار چکی ہیں۔ وہی ڈانٹ وہی پیار انہیں بھی ایسی ہی فکریں لاحق ہوتی تھیں۔ وقت پر گھر آئو وقت پر کھانا کھائو ایک بار تو کھانا نہ کھانے پر اچھی خاصی دھنائی ہوئی تھی۔

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

کیوں کرتا ہے وہ ایسی باتیں، حالات آج تو ایسے نہیں۔ ہوے۔ غربت آج تو نہیں دیکھی۔ یہ تو ہمیشہ سے ہماری سانس سے سانس لیتی آ رہی ہے اب تک تو سمجھا تا ہو جانا چاہتے تھا۔ ہر روز تڑپنے سے کیا حاصل ہے اس شخص کی تلخیی اور میری سوچ کیا کبھی کنارہ ہوگا ان دونوں کا مجھے بہر حال کنارہ چاہیے۔ جب بھی ملے! اسی شخص کے ساتھ یہ جہاں کنارہ کرے گا مجھے بھی وہیں رکنا ہے اس نے یورینورسٹی گیٹ سے باہر نکلتے ہوے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا تھا جہاں وہ ابھی تک اسی انداز سے اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا ایک نیا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جس وقت وہ گھر پہنچی، پونے تین ہو رہے تھے،۔ پریشر کوکر کی شوں شوں میں لبی چنے کی دال کی خوبشو پر اس نے دروازے پر ہی ناک چڑھالی تھی۔ آپا یہ کیوں پکائی ہے وہ وہیں سے چیختی ہوئی اندر آئی تھی۔ کبھی تو آتے ہوے سلام کرلیا کرو، دروازے پہ ہی شروع ہو جاتی ہو، یہ کیوں پکایا وہ کیوں پکایا آپا نے اپنے کپڑے استری کرتے ہوے اسے لتاڑا تھا۔ تو آپ کوئی اچھی چیز کیوں نہیں پکا تیں۔

سینڈل اسٹریپ کھولتے اس کی ابھی تک ایک ہی رٹ تھی چولہا بند کر کے آوء۔ پک گئی ہوگی۔ واہ اس کے اس اعتراض کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لائی تھیں۔ اللہ کرے جل گی ہو، وہ پاؤں پٹخ کر کچن کی طرف جاتے ہوے بولی، صبح یونیورسٹی جاؤ تو اماں کو جانے کی جلدی، واپس آ ؤ تو آپا غائب اتنی افراتفری کیوں ہے ہم تینوں کی ذات کے اندر۔ اتنی دوڑ دھوپ، اتنی محنت پھر بھی خالی ہاتھ سارا دن پیسے کے لے ایک دوسری شکلوں کو ترستے رہو دامن پھر بھی خالی یونیورسٹی میں صرف اس لیے کچھ نہین کھایا کیونکہ کرائے کے لیے پیسے بچانے تھے۔ اس سڑی ہوئی دال سے اتو اچھا تھا وہیں سے کچھ کھا لیتی پھر بھلے سے پیدا آ نا پڑتا۔ وہ پریشر کا ڈھکن کھولتے ہوے مسلسل کلس رہی تھی اپنی جلتی ہوی سوچ پر اس کا دھیان غیر اردی طو پر اس کے سلگتے ہوے لفظوں میں الجھ گیا تھا۔ میں دعوے سے کہ سکتی ہوں کہ میں یعنی ماریا سو میں سے اسی فیصد اس شخص جیسی بن چکی ہوں رانجھا رانجھا کر دی میں آپے رانجھا ہوئی وہ اپنی اس بے تکی سوچ پر خود ہی ہنس پڑی ہتی۔ کبھی کبھی میں تمہارے بارے میں

مشکوک ہونے لگتی ہوں اسے اکیلے اکیلے ہنستے دیکھ کرآپا نے صحن میں بیسن کے سامنے کھڑے ہوئے کراپنی چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے کہا۔کتنا مزہ آتا ہے ناں جب کوئی ہمارے بارے میں مشوک ہو، کچن سے اس کے دوبارہ کھلکھلانے کی آواز آئی تھی۔

تم جب ہنستی ہوتو مجھے بہت اچھا لگتا ہے وہ کنگھی میں سے بال نکالتے ہوئے بولیں۔تھینک یو وہ پلیٹوں میں چاول نکالتے ہوئے مسکرائی تھیں۔جانانہیں ہے کیا آج تو بہت تسلی ہے آپ کے انداز میں۔جانا ہے بھئی تم جلدی سے کھانا نکال دو، میں واقعی لیت ہورہی ہوں۔وہ اپنی چادر باہرتار پرڈال کرآتے ہوئے بولیں کیسی عجب بات ہے آپا!ہم تینوں روزانہ اپنے اپنے معمول کافقرہ دہراتے ہیں میں روازنہ واپسی پر یہی کہتی ہوں یہ کیا پکایا اور آپ باقاعدگی سے اس وقت تیار ہوتے ہوئے کہتی ہیں۔آج تو واقعی میں لیٹ ہوگئی اوراماں بلاناغہ گھر میں قدم رکھتے ہی کہیں گی۔آج تو بہت گرمی پڑرہی ہے بھئی۔اس نے اماں کے انداز کی اس خوب صورتی سے نقل اتاری تھی کہ آپا بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔اور حسب معمول سنجیدہ تھی کیونکہ وہ اپنے مذاق پرکبھی نہیں ہنسی تھی۔کتنی لڑکیاں سگھڑ بنی ہیں آپ کے ہاتھوں، وہ بات کارخ بدلتے ہوئے پوچھنے لگی۔ایک بھی نہیں وہ بے ساختہ مسکرائی تھیں۔سوئی بھی سیدھی پکڑلیں تو بڑی بات ہے میں تو ان سب سے التجا کرتی ہوں کہ اگرکوئی پوچھے کہ یہ ہنرکس سے سیکھا ہے تو خدا کے واسطے میرا نام مت لینا آپا نے ہنستے ہوئے کہا۔وہ انڈسٹریل ہوم میں ایمبرائڈری ٹیچر تھیں۔ ساڑھے تین بج گئے ہیں۔آج تو آپ واقعی لیٹ ہورہی ہیں آپا اب جائیں میں بھی کچھ دیر آرام کروں گی۔پھرشام تو بچوں میں ہی گزرجاتی ہے اور آج تو میرے سر میں درد بھی ہورہا ہے وہ ان کے پیچھے دروازہ بند کرنے کے ارادے سے اتے ہوئے بولی۔دوا کھا کرچاے پی لینا تھوڑی دیرتک مکمل طور پرسکون رہنا ہے بچے پڑھنے کے لیے آجائیں تو دروازہ اندر سے بند کرلینا اماں کو دروازہ کھلا ملے تو غصہ ہونے لگتی ہیں۔ وہ اسے روزانہ کی ہدایات دیتے ہوئے باہرنکل گئیں۔

اس نے آخری شعر جس گھمبیرتا سے پڑھا تھا۔اسے سن کر سامنے کھڑی کے ہاتھ سے مارے بوکھلاہٹ سے کتابیں چھوٹ کرنیچے گرپڑی تھیں۔کیا ہوا آمنہ نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔انتہائی بدمعاش آدمی سے دل لگایا ہے میں نے وہ نیچے بیٹھ کرکتابیں اٹھاتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔یہ تو واقعی ٹھیک کہا تم نے بندہ دل لگاے تو چھان پھٹک کرلگاے۔وہ بھی اس کے ساتھ کتابیں اٹھاتے ہوئے مزید جلتی پرتیل چھڑکنے لگی۔واہ یارکمال ہے بُھئی یوں ہی سے اشعار میں بھی جان ڈال دیتے ہوتم۔اکمل نے سردھنتے ہوئے کہا بہت بازوق انسان ہوتم ورنہ لوگوں کوتو اشعارسن کرجان کے لالے پڑجاتے ہیں سمجھ میں ہی نہیں آتے اس نے دلچسپی سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کرتے ہوئے اکمل کی طرف دیکھا۔آپ لوگوں کو بدذوق ہی رہنے دیجیے وہ اسی میں خوش ہیں۔آمنہ نے اپنی سہیلی کی طرف داری میں تململاتے ہوئے جواب دیا۔ہاں تمہارے ذوق کوتو میں اچھی طرح جانتا ہوں بابرعلی کی دیوانی اس نے نشانے پرتیر مارا تھا کہ دوسری طرف اچھا خاصا درد اٹھا تھا۔ دیکھومیں اس کے خلاف ایک بھی بات نہیں سنوں گی سمجھے تم وہ لال پیلی ہوتے ہوئے بولی تم کیا جانو اعلاذوق ہوتا کیا ہے تمہارے جیسے بندے کو تو کوئی پسندنہیں کرسکتا وہ طنزیہ انداز میں سر سے پاؤں تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔خدا کے واسطے آپ مجھے اپنے اعلاذوق کی لسٹ میں لاییے گا بھی مت خوامخواہ بد سے بدنام براوالی بات ہوجاے گی۔وہ باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔فارغاڈسیک کبھی تو

ان حرکتوں سے باز آ جایا کرو، ہر بات میں بے چاری کی پیچھے پڑ جاتے ہو وہ دفاعی انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ یہ بے چاری ہے اس جیسی بے چاریاں دنیا میں چار اور آ جائیں تو قیامت دور نہیں۔ وہ گز بھی اسے بے چاری ماننے کو تیار نہیں تھا۔

ہاں اور جب قیامت آئے گی تو پہلا پہاڑ تم ہی پر ٹوٹے گا۔ وہ بہت سکون انداز میں کہتے ہوئے اٹھی اور کپڑے جھاڑتے ہوئے پیچھے پلٹ گئی۔ رکو تو وہ پہاڑ کہیں تمہارے جیسی کسی بے چاری کا ہی ڈھایا ہوا نہ ہو۔ وہ بولتے ہو یاس کے پیچھے لپکا تھا بے فکری ایک بہت بڑی نعمت ہے اس دنیا میں وہ جو بہت دلچسپی سے ان دونوں کو آگے پیچھے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات پر چونک کر مڑی تھی۔ ہاں اور یہ نعمت ہر انسان کو حاصل ہو سکتی ہے اگر وہ چاہے تو۔ وہ دانستہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی بے فکر لاشعوری ہوتی ہے شعوری نہیں نعمت ملتی ہے بکتی نہیں۔ میری ہزاروں خواہشوں میں سے ایک خواہش تمہاری بے فکری ہے۔

کاش تم بھی آئمہ جیسی ہوتیں پورے ڈپارٹمنٹ میں برملا یہ بات کہتیں میں بابر علی سے شادی کروں گی۔ کسی چلبلی سی شوخی ہے اس کے اندر کبھی تم نے محسوس کیا میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی حسرت نہیں دیکھی کاش کبھی ایسا ہوا کہ تم بس کرو، مجھے اس کے ساتھ کمپیر مت کرو، کیونکہ مجھے اس جیسا نہیں بنا مجھے بابر علی سے شادی نہیں کرنی مجھے اپنی ذات ے اندر رہنے دو، مجھے اور کچھ نہیں چاہے۔ میری ذات کے اندر کیا ہے مفلسی وہ تڑخ اٹھا تھا مجھے مفلسی دے دو۔ میرے پاس غربت کے دکھ ہیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ءبولا۔ تم مجھے غربت کے دکھ دے دو اس کا لہجہ بھیگ رہا تھا یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ کیا کروگی اتنی مفلسی کا۔ وہ بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔ تم یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس پہلے سے موجود ہس کیا کروگی اتنی مفلسی کا وہبہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

تم یہ دونوں چیزیں مجھے دے دو میرا وعدہ ہے میں یہ تمہیں واپس نہیں لوٹاؤں گی۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ بہت آبلہ پائی ہے۔ وہ ایک لفظ ادا کرتے ہوئے بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وعدہ سوچے سمجھے بغیر نہیں کیا جاتا۔ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔ ایک وعدہ مجھے بھی تم سے کرنا ہے کیا اس نے بہت آس سے اس کا چہرہ دیکھا تھ۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہارے نکوھں میںچے ہوئے ایک ایک خواب کو تعبیر میں بدل دوں گا اور اگر میں ایسا نہ کر سکا تو تمہاری آنکھ کا خواب بھی نہیں بنوں گا۔ میں ابھی نہیں جانتا کہ اپنے وعدے کو پورا کرنے میں مجھے کتنا لگے گا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں وہ بغور اس کے ءچہرے کے ایک ایک نقش اس کی پلکوں کی اٹھتی گرتی لرزش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مجھے آسائشات کی خواہش ہے تم مجھ پر وہ احسان کیوں کرنا چاہتے ہو۔ جس کی مجھے خواہش نہیں میں نے اپنی زندگی میں جتنی آسائشیں دیکھی ہیں۔ میں صرف ان کو وہ جانتی ہوں میں نہیں جانتی اس سے بڑھ کر دینا میں کیا آسائشات ہیں اور میں جاننا چاہتی بھی نہیں۔ دنیا چاند پر جاتی ہے مجھے نہیں جانا مجھے زمین پر کھڑے ہو کر چاند دیکھنے کی خواہش ہے دنیا کو دولت سے محبت ہے مجھے نہیں ہے مجھے تم سے محبت ہے تم سے وہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔

ایک واقعہ سناؤں تمہیں کچھ دن پہلے ٹی وی پر ایک فلمی پروگرام میں میڈم شمیم آرا نے کمپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کہا میں نے سعود کے ساتھ میرا کے بجائے ریما کو کاسٹ کیا ہے وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے سکون سے بیٹھا ہوا تھا۔ تمہاری یہ بے تکی مثال مجھے ذرا بھی پسند

نہیں آئی۔لیکن بہر حال میں اس سے اتفاق کرتی ہوں ایک ایکٹر کے بدل جانے سے فلم تو مختلف نہیں ہوسکتی لیکن ایک انسان کے مل جانے سے زندگی ضرور مختلف ہوسکتی ہے اور یہ اتنا سا فرق ہی میری سب سے بڑی خواہش ہے وہ کتابیں سمیٹکر بیگ میں ڈالتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔گھر جا رہی ہو۔وہ اسکی تیاری دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا ہاں آج مجھے جلدی جانا ہے میں چھوڑ آؤں، وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔نہیں مجھے ذرا جلدی جانا ہے وہ بڑے مصروف انداز میں اسے چھیڑ بیٹھی تھی اچھا تو پھر پوائنٹ سے چلی جاؤ۔وہ بڑے آرام سے اس کا طنز پی گیا تھا۔میں تمہاری بائیک کی شان میں گستاخی کی ہے حسب معمول ڈانٹو گے نہیں نہیں آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔اس لیے آج تمہاری سب گستاخیاں معاف وہ جلتے ہوئے سگریٹ کو پاؤں تلے مسلتے ہوئے بولا تھا اور نظریں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔وہ جو کل تم نے مجھے افسانوی ادب کے نوٹس دیے تھے نا وہ آئمہ کے پاس ہیں میرے جانے کے بعد تم اس سے لیے لینا۔

خوامخواہ پوری کلاس کو بانٹتی پھرے گی۔وہ اس کی نظروں سے گھبراتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔جی بہتر لے لوں گا کچھ اور وہ انتہائی مؤدب انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔اس کے اس انداز پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔پہلی دستک پر ہی بھابھی نے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے اسے کھڑا دیکھ کر وہ ناراض ہونے لگی تھی۔آج پورے دو گھنٹے لیٹ آئے ہو تم کہاں رہے اتنی دیر میں کب سے دروازے پر کھڑی تھی۔آئے دن کے ہنگامے، پیچھے دل ہولتا رہتا ہے میرا۔سیدھے گھر آیا کرو، چاہے پھر چلے جاؤ۔۔وہ چپل گھسٹتے ہوئے کچن کی طرف جاتے ہوئے بولیں ان کے لہجے میں چھپی فکرمندی محسوس کر کے وہ طمانیت سے مسکرا اٹھا تھا۔بائیک کو صحن میں کھڑا کرنے کے بعد وہ سیدھا بھائی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔اور حسب معمول نہایت خاموشی سے پینٹ کی جیب سے دوائیاں نکال میز پر رکھیں اور باہر نکل آیا۔

کیا پکا رہی ہیں۔اس نے ہلکے سے کچن کا دروازہ بجاتے ہوئے پوچھا وہی، وہ نہایت اطمینان سے مسکراتی تھیں۔اس وہی سے جان کب چھوٹے گی، بھابھی آپ مینو بدل نہیں سکتیں۔بدل سکتی ہوں بھیا۔بشرطیکہ تم دنوں بھائی بھی بدل جاؤ ایک چار بجے آرہا ہے تو دوسرا پانچ بجے یہ نہ پکانے کا وقت ہے اور نہ کھانے کا تم لوگ اپنی روٹین بدلو میں مینو بدل لوں گی۔بھابھی نے چولھے پر توا چڑھاتے ہوئے بہت سکون سے جواب دیا تھا۔

کبھی کبھی بہت جی چاہتا ہے آپ کو اماں کہہ کر پکاروں آپ بالکل اماں کا روپ دھار چکی ہیں۔وہی ڈانٹ وہی پیار انہیں بھی ایسی ہی فکر یں لاحق ہوتی تھیں۔وقت پر گھر آؤ وقت پر کھانا کھاؤ ایک بار تو کھانا نہ کھانے پر اچھی خاصی دھنائی ہوئی تھی۔میری بس اتنا ہی کہا تھا یہ کیوں پکالا بس پھر نہ پوچھیں کیا کیا کھانا پڑا مجھے کوئی گزری بات یاد کرتے ہوئے اسکی آنکھیں ستارہ بن گئی تھیں۔اس کی بات پر ان کے اندر کی کوئی محرومی مچل کر آنکھوں میں چھلک آئی تھی جسے انہوں نے چھلکنے سے پہلے صاف کر دیا تھا۔میں ماں نہیں بن سکی مگر ماں جیسی تو بن سکتی ہوں میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا بیٹا سمجھا ہے کہا ہے مانا ہے میں نے کبھی کہا تو نہیں لیکن میری خواہش ہے کہ تم مجھے ماں کہہ کر پکارو، انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا اماں وہ انکے گرد اپنی بانہیں پھیلاتے ہوئے لاڈ سے بولا۔یہ آنسو نہیں چاہیں۔

وہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں صاف کرنے لگا۔تم بیٹھو میں کھانا نکالتی ہوں۔انہوں نے پلٹتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا اور ابھی وہ کھانا

کھاہی رہاتھا۔ جب بھائی آگے۔ ابھی آے ہوکیا۔ انہوں نے اسے اس وقت کھانا کھاتے دیکھ کر پوچھاجی جواب انتہائی مختصر تھا۔ جلدی گھر آیا کرو ابھی پھر تمہیں جانا ہے پل کے پل گھر آتے ہو اور پھر غائب محنت ضرور کرو مگر خود پر ظلم مت کرو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اپنی بات کرتے ہوے وذرا سا کھانسے تھے اور اس کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا تھا ایک پل میں وہ ان کے قریب پہنچا تھا۔ آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے بائیک لے جایا کریں۔ یوں اتنی دورے سے بسوں کی خواری مگر آپ نہیں مانتے میری بات تھکن بڑھ جاتی ہے۔

اس طرح بھائی وہ فکرمندی سے ان کی طرف دیکھتے ہوے بولا۔ بھائی کے چہرے کی زردرنگت آنکھوں کے گرد گھرے ہوتے ہوے سیاہ حلقے دیکھ کراس کے اندر کی وحشت بڑھنے لگی تھی بائیک چلانے کی اب ہمت نہیں ہے۔ بیٹا خوف آنے لگتا ہے نجانے کس وقت طبیعت بگڑ جاے اکیلا آدمی کیا کرسکتا ہے۔ ان کا لہجہ خود بخود دھیما جارہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کم سے کم اس موضوع پر بات کرتے تھے۔ وہ بے حد جذباتی تھا۔ ان کی بیماری اس کے اندر کوبھی تاریک کررہی ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ بار بار اس بے حد جذباتی تھا۔ ان کی بیماری اس کے اندر کوبھی تاریک کررہی ہے یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ بار بار اس بات کا اظہار انہیں تکلیف پہنچاتا تھا۔ وہ چند لمحے بے حد خاموشی سے ان کا زور پڑتا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھراسی خاموشی سے اٹھ کروہ بائیک باہر نکالنے لگا۔ ۔ پنل ابھی مت نکلو، چاے پی کرجاو بنارہی ہوں۔

بھابھی نے اسے باہر نکلتے دیکھ کر کہا تھا۔ طلب نہیں ہے اماں اس کی نہایت دھیمی آواز ان تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ ابھی تو اکیڈمی کا ٹائم نہیں ہوا ہے۔ بھائی کی بات پراس کے قدم ست پرنے لگے تھے آج مجھے جلدی جانا تھا۔ مزید ٹیوشنز لے لیے ہیں کیا۔ انہوں نے بغوراس کی طرف دیکھتے ہوسوال پوچھا تھا۔ کچھ ایسا ہی ہے آج نو بجے آوں گا اس بار پھراس آہستگی سے جواب دیتے ہوے کہا اور باہر والے دونوں دورواز ے کھول کر بائیک نکالی۔ دوازہ بند کرلیں۔ اماں بائیک اسٹارٹ کرتے ہوے اس نے بھابھی کوپکارتے ہوے کہا تھا اور دروازہ بند ہونے سے پہلے تک اس کی بائیک گلی کے موڑئ تک پہنچ چکی تھی۔

وہ کنٹین سے واپس ڈپارٹمنٹ پہنچی تھی کہ آئمہ نے سے متوجہ کیا اس نے حیران ہوکر دیکھا سامنے کا منظر واقعی اس کا خوان کھولا دینے کے لیے کافی تھا کیونکہ اس کی نظروں کے بالکل سامنے کلاس کی مس ڈپارٹمنت انتہائی سیلولیس شرٹ پہنے نور کے بے حد قریب بیٹھی تھی۔ کلیجے میں آگ اس وجہ سے بھی لگی تھی کہ اس کا نازک ہاتھ نور کے ہاتھوں میں تھا آن وحدا میں وہ ان دونوں کے قریب پہنچی تھی۔ اف مار یا تم کہاں تھیں۔ اتنی دیر سے دیکھوتو نور نے میرے بارے میں حرف بہ حرف سچ بتایا ہے یہ کہ میری عادت کیا ہیں۔ میری سوچ کسی ہے اور یہ بھی کیہ میرا فیوچر کیسا ہوگا۔ شائستہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوے نہایت خوشی سے کہا تھا۔

ہاں دوسروں کے مستقبل کے پیش گوئیاں یہ خوب کیا کرتے ہیں۔ اس نے ذومعنی لہجے میں کہتے ہوے شائستہ کے خوب صورت چہرے کے طرف دیکھا جو اس وقت اندورانی خوشی سے مزید گلاب بن گیا تھا پتا نہیں کیا کہہ بیٹھا ہے اس سے کے جلسے کٹے لہجے پر نور کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔ تم نے کبھی اسے اپنا ہاتھ دکھایا، اس کا اشتیاق تو کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ نہیں لیکن لگتا ہے ہاتھ دکھانا ہی پڑے گا۔

اس نے ایک بار پھر ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ اس دفعہ نور اپنا قہقہ نہیں روک سکا۔ فیوچر کا اتنا خوب سورت نقشہ کھنچا ہے وہ بہت پرجوش تھی۔

قسمت چکر کی طرح بدلتی ہے لکیروں کا کیا اعتبار آج نہیں کل مٹ گئیں۔اس نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔لکیروں کا نہ سہی انسانوں کا اعتبار تو ہوتا ہے نا ،اس نے ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔بات اعتبار تک پہنچ چکی ہے اس نے کڑی نظروں سے نور کی طرف دیکھا اور اس وقت سے خاموش آئمہ کی کھی کھی شروع ہوگئی تھی۔اف شائستہ بہت خوب صورت شرٹ پہنی ہے تم نے کیا خود پینٹ کی ہے ذرا دکھاءو تو۔آئمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ہاں میں نے خود ڈایزائن کی ہے دوسروں کی بنائے ڈائزین مجھے تو پسند نہیں آتے۔میں ہمیشہ اپنے ڈریسز خود ڈایزائن کرتی ہوں وہ گپ ہانکنے لگی تھی۔کل گل ناز مجھ سے کہہ رہی تھی کوئی اچھا ڈیزائن دیکھو تو مجھے ضرور بتانا اس کی آپی کی شادی ہونی والی ہے نا۔اس لے میرے خیال میں اسے یہ ڈیزائن بہت پسند آئے گا اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ہم ابھی یہ شرٹ اسے دکھا سکتے ہیں۔وہ کینٹین میں ہے اس وقت چلیں اس نے بہت چاپلوسی سے اس کی تعریف کی تھی۔اسکیم کامیاب ہوگئی تھی کیونکہ وہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

کیا تھا یہ سب کچھ ان دونوں کے جاتے ہی وہ اس پر آنکھیں نکالنے لگی۔کچھ بھی نہیں بھئی ہاتھ دیکھ رہا تھا میں اس کا تم خوامخوہ بے چاری پر بگڑ گئیں اس نے جان بوجھ کر اسے بے چاری کہا۔بے چاری لفظ بے چاری پر وہ تلملا اٹھی تھی۔ہاتھ دیکھنے کے لیے ہاتھ پکڑنا ضرور نہیں ہوتا۔اس نے تڑختے ہوئے کہا تھا۔اوہ تو اصل جلن اس بات کی ہے میں بھی سوچ رہے تھا یہ تلملاہٹ کس بات پر ہے۔مجھے جلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم ہاتھ پکڑ کر لکیریں دیکھو یا سر پر بٹھا کر ،مجھے اس کی پروا نہیں ہے سمجھے تم۔اس کا مزاج ابھی تک برہم ہے۔جل تو تم رہی ہو۔اب اقرار نہ کرو تو اور بات ہے اچھا لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں۔وہ بہت صلح جو انداز میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔جی نہیں شکریہ مجھے نہیں دکھانا کیونکہ میں جانتی ہوں۔آپ کم از کم مجھے اتنا سہانا مستقبل ہرگز نہیں دکھائیں گے اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔اچھا اب ناراض تو مت ہو وہ اس کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔میں کیوں ناراض ہوں گی۔

وہ بھی مس ڈپارٹمنٹ کے لیے وہ مسکرا دی لیکن آئندہ جب بھی اس کا ہاتھ دیکھنا ہو تو ہاتھ پکڑنے کی ضرورت نہیں اس کی سوائی ابھی تک وہیں اٹکی تھی۔جی بہتر اور کچھ اوہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولا بس اب تو وہ کام بتاؤ جس کے لیے تم صبح سے بے چین پھر رہی ہو تمہیں کیسے پتا کہ مجھے کوئی کام ہے اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔وہ بہت سکون سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا تھا۔بکواس مت کرو۔اس نے اپنی جھنپ مٹاتے ہوئے کہا۔اچھا یہ دیکھو۔یہ اردو مضمون نگاری میری بالکل سمجھ میں نہیں آرہی ہے کل اسے پڑھتے ہوئے میرے سر میں درد ہونے لگا ہے بیگ سے کتاب نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ہر چیز اس وقت تک مشکل ہوتی ہے جب تک ہمارا ذہن یکسو نہ ہو۔بہر حال لاؤ میں سمجھا دیتا ہوں۔وہ کتاب اسکے ہاتھ سے لے کر کھولتے ہوئے بولا وہ پچھلے چار سال سے ٹیوشن پڑھا رہا تھا۔اتنے اچھے اور سادہ الفاظ میں سمجھاتا تھا کہ سمجھنے والے کے ذہن کی گرہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی تھیں۔اب بھی ایسا ہی ہوا تھا کل تک جو چیز اسے بہت مشکل لگ رہی تھی۔اب بہت آسان اور عام سی لگ رہی تھی۔

اماں فیکٹری سے آتے ہی چپ چاپ چارپائی پر پہ لیٹ گئی تھی۔کوئی گہری سوچ تھی جو چوبیس گھنٹوں کے ہر پل ان کے ساتھ رہتی تھی۔

کھانالاؤں اماں وہ جوٹیوشن کے لے آے بچوں کی سائنس کی کاپیوں کاڈھیرے لگاے ڈائیگرام بنارہی تھی۔سب کچھ وہیں چھوڑ کے ان کے پاس آئی تھی۔نہیں ایک پالی چاے بنادو۔اماں نے بہت تھکے تھکے لہجے میں کہتے ہوے اس کی طرف دیکھا تھاتم نے اج پھر دروازہ کھلارکھا۔کتنامنع کرتی ہوں میں تمہیں اسے کچن کی طرف جاتے ہوے پیچھے سے اماں کی ڈانٹ سنائی دی۔دھیان نہیں رہتااماں بچے آتے جاتے رہتے ہیں تو پر بار بار اٹھناپڑتا ہے اس نے کچن سے ہی اپنی کوتاہی کی وضاحت کرتے ہوے کہاتھا۔ان سے کہوں ایک وقت پہ آیا کریں اوری ڈائیگرام تم کیوں بناکے دیتی ہوانہیں خود کیوں نہیں بناتے۔یہ امتحانوں میں کیا کریں گے۔سارابوجھ اپنے سر پہ لے رکھا ہے صحت پہلے ہی گرتی جارہی ہے تمہاری۔مجھے یہ نقصان میں لپٹا ہوافائدہ نہیں چاہے۔اب ان کے لہجے سے تشویش جھانکنے لگی تھی۔یہ کوئی طریقہ ہے اس طرح تو کوئی بھی اپنی جان نہیں مارتا۔ان کے لہجے میں چھپی تشویش پراسے ماں برجی جان سے پیارآیا تھا۔اماں کچھ نہیں ہوتا مجھے۔وہ چاے کا کپ سامنے رکھتے ہولاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوے بولی تھی۔اللہ نہ کرے اماں نے دہلتے ہوے سوچاتھادواوقت پر کھایا کرو،سب سے اہم اپنا آپ ہونا چاہیے پھر کوئی دوسرا کام انہوں نے بہت دھیمے لہجے میں اس نظریں چراتے ہوے کہاتھا۔وقت پرہی کھاتی ہوں اماں،وہ آہستہ سے کہتے ہوے بچوں کی طرف بڑھ گئی۔ٹیچر کل میرا میتھ کاٹمیٹ ہے فائیوکلاس کے ایک بچے نے اسے دیکھتے ہی منہ لٹکایا۔اوہو!تو اس میں بنامنہ لٹکانے والی کون سی بات ہے۔وہ ہنستے ہوے بولی۔لاؤ کتاب وہ بچے کوسوال سمجھانے لگی تی۔بچہ سمجھ نہیں پارہاتھا۔ایک ہی سوال اسے دس بارسمجھاناپڑرہاتھا۔مغرب کی اذان شروع ہوچکی تھی۔جب آپا واپس آئی اوراسے بھی تک بچوں کی پڑھاتا دیکھ کروہ ناراض ہونے لگی تھیں۔مغرب کی نماز کے وقت ختم ہورہاہے ماریا۔

تم کب چھٹی دوگی ان کو۔کل علی کاٹمیٹ ہے اس لیے اج دیرہوگئی۔اس نے ذرا کی ذراکتاب سے نظریں اٹھاتے ہوے جواب دیااورنماز پڑھنے کے بعد بھی اس نے بچوں کی چھٹی نہیں کی تھی۔ساڑھے سات بجے تک وہ مسلسل ان کوپڑھاتی رہی اورپھر بچوں کے جاتے ہی دروازہ بند کرکے وہ کچن میں چلی آئی جہاں آپا کھانے کی تیاری کررہی تھی۔تمہارے یہ طریقے مجھے بالکل پسند نہیں ان کی ناراضی بدستوقائم تھی۔اپا ان کی پڑھائی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے میں ان سے لاپروائی نہیں برت سکتی میں یہ نہیں کہتی تم لاپرواہوجاؤ۔ذمہ داری ضرورلومگر اس حدتک نہیں ایک ہی مشق سات بارکروائی ہے تم نے علی کوجبکہ وہ اچھی طرح سے سمجھ آچکی تھی۔وہ اسے ڈپٹتے ہوے بولی تھیں۔بس کچھ اوران کی لمبی چوڑی ڈانٹ کے جواب میں اس نے بہت سکون سے پوچھا آپا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔میں کمرے میں جارہی ہوں۔کھانا وہیں لے آئیں۔وہ باہر نکلتے ہوے بولی تھیں۔اندرجاتے ہی وہ اماں کے پاس ان کی چارپائی یہ چڑھ کے بیٹھ گئی تھی۔اماں ہوں۔جب میں نوکری کروں گی ناں پھراپ کی نوکری چھڑادوں گی۔اسنے خالص بیٹوں والا انداز اپنایا تھا۔

اچھاٹھیک ہے اماں نے اس کادل رکھتے ہوے ہنس کر کہا تھا۔ہاں جب ماریا کونوکری مل جاے گی ناں تو پھر ہم یہ کراے کا مکان چھوڑ کربنگلہ خریدلیں گے کیوں اماں آپا نے اندرآتے ہوے مسکراکر جواب طلب نظروں سے اماں کی طرف دیکھا تھا۔ہربات کے دورخ ہوتے ہیں نگیٹیوں بھی اورپوذیٹوبھی اگر ہماری ایک اچھی سوچ سے ہمیں سکون مل سکتا ہے تو کیاحرج ہے۔فرض کرو سوچ لیا اسسے کیا ہوگا۔فرضی سوچ

فرضی سکون کھلےلفظوں میں بہلاوا۔اپااس کی بات کاٹتے ہوئے بولی تھیں۔ جو سارادن روزی روٹی کے لے ہاتھ مارتے ہوں انہین بہلاوے سکون نہیں دتیے زندگی سوچ کے سہارے نہیں گزاری جاتی ماریا۔ آپانے اماں کے لیے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا۔ ہرعمل سے پہلے ایک سوچ ہوتی ہےاور ہرسوچ کاایک عمل کوجنم دیتی ہےسوچ جتنی اچھی ہوگئ عمل اتناہی بہتر ہوگا۔ وہ اپنے موقف پرڈٹی ہوئی تھی۔تو پھر کیا سوچا ہےتم نے بہت سی اچھی باتیں اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھی۔مثلا انہوں نےنوالہ چباتے ہوئے پوچھا۔ جب مجھےنوکری ملے گی تب میں اماں کے لیےسرخ غلاف والاتخت بنواؤں گی۔جس پر بیٹھ کراماں سارادن مجھےحکم دیا کرین گی۔

ماریا جوتالاؤ۔ماریا کھانالاؤ۔وہ اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کرہنستے ہوئے بولی۔اماں نے پیار سےاس کا ماتھاچوم لیا۔صرف تمہیں اماں مجھےبھی تو آوازدیں گی۔آپانے احتجاج کیاتھا۔آپ کی تو شادی ہوجاے گی ناں۔ کیوں وہ سہانے دن میں کیوں نہیں دیکھوں گی کبھی کبھی آجایا کیجئے گااس نے شاہانہ انداز میں اجازت دیتے ہوئے کہاتھا۔اور جب تمہاری شادی ہوجاے گی تو پھراماں کسےحکم دیا کریں گی۔آپانے ایک نیاپوائنٹ نکالا اماں اور میں ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔بھئی میں بیار بندہ ماں کےبغیر کیسے رہ پاؤں گی کسی دن چپکے سےمرمرا جاؤں تو پتابھی نہ چلے۔اس نے انتہائی برمذاق کیاتھا۔کمرے میں ایک خاموشی چھاگئی صرف برتنوں کی آوازتھی۔ جوآپا اٹھا کرباہرلے جارہی تھی۔اسےاپنے غلطی کاشدت سے احساس ہواتھا۔عشاء کی نمازپڑھےبغیر بستر پہ مت جانا۔ پڑتے ہی سوجاتی ہو پتانہیں اس نماز کی انتی ستی کیوں ہے تمہیں۔ چار دیواری بنا کےچھت نہیں ڈالاتو دیواروں کافائدہ جب سر پرسائبان نہ ہوں اٹھ کے نماز پڑھو،اماں اسے بہت ہلکی آواز میں ہدایت کرتے ہوئے اٹھی تھیں۔جی اماں اس کی شرمندگی میں ڈوبی آوازابھری۔

پنل وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیارہورہاتھا۔جب بھابھی نے اندرآتے ہوئےاسے پکاراجی اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے پلٹ کرکہا۔تم آج یونیورسٹی مت جاؤ۔کیوں۔میں چاہ رہی تھی تم آج ان کے ساتھ ہاسپٹل چلے جاتے۔اج نوتاریخ ہےناچیک اپ کی تاریخ دی تھی۔ڈاکٹر نے وہ پلنگ پرپڑےاس کے کپڑے اٹھا کرکھونٹی پرلٹکاتے ہوئے بولیں۔ مجھےیادہے بھابھی شام کی اپائمنٹ لے چکاہوں۔ڈاکٹر سےان کے پرائیویٹ کلینک میں دکھانا چاہ رہاتھا گورنمنٹ ہسپتالوں میں تو باکل توجہ نہیں دیتے ڈاکٹرز۔لیکن پرائیویٹ کلینک کی فیس آپ کیوں پرواکرتی ہیں میں توہوں ناں۔ وہ انکے دونوں شانوں پراپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ہاں تم ہی تو ہووہ اس کے چہرہ دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ بھائی کیاکررہے ہیں۔ناشتہ کررہے ہیں۔چلوآؤتم بھی۔وہ باہر نکلتے نکلتے بھی اس کے سلیپر دروازے کے پیچھے رکھتے ہوئے بولیں۔ وہ ان کی نفاست پسندی پربے ساختہ مسکرایا تھابھابھی! ناشتہ بھائی کے کمرے میں لےآئے گا وہیں بیٹھاہوں میں اس نے صحن میں کھڑے ہوکر کہااور بھائی کے کمرے میں چلاایا۔اب کیسی طبیعت ہےاپ کی اس نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

تھیک ہوں تم آج یونیورسٹی نہی جاؤگے۔انہوں نے اس کے پرسکون انداز کو دیکھتے ہوئے پوچھااور نہ تو وہ ہمیشہ بہت علجت میں ہوتا تھا۔ نہیں آج چھٹی کاموڈ ہےاکیڈمی بھی نہیں جاؤں گااس نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔وہ اس کی چھٹی کی وجہ جانتے تھےمگر کہہ نہیں پائے۔آپ جائیں گے آج۔اس نے سوالیہ نظروں سےان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھانہیں آج بہت تھکن ہورہی ہے۔یوں بھی میں ریٹائرمنٹ کاسوچ

رہا تھا اگر کوشش کرکے ممکن ہو سکے تو میں دیکھوں گا وہ ان کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ بھابھی پتا نہیں کیا کر رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔ آ گئی ہوں بابا! آج کس بات کی جلدی ہے تمہیں آج گھر میں ہو تو ہر کام سکون سے کرنا ہو گا۔ ہر وقت کی افراتفری سے تھکتے نہیں ہو تم وہ ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ کے اسے ڈانٹنے لگیں۔ اور آپ ہر وقت گھر کے کام کرتے ہوئے تھکتی نہیں۔

اس نے ٹرے اپنی طرف کھسکائی بالکل نہیں۔ اسی طرح میں بھی نہیں تھکتا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن میں تھکنے لگا ہوں۔ ان کی بہت دھیمی سی آواز ابھری تھی۔ ایسا کیوں کہتے ہیں آپ۔ وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا میں تمہیں بہت خوشیاں دینا چاہتا تھا وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ہم خوش ہیں بھائی ہم سب اس نے محبت سے ان کا ہاتھ چوما تھا۔ نہیں جو میں نے سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ جو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ہو رہا ہے میں تم دونوں کو بہت سی خوشیاں دینا چاہتا تھا لیکن نہیں دے پایا تمہیں نہ تمہاری ماں کو ماں کہتے ہو نا تم اسے ہمیشہ ماں کہتے رہنا ہو سکتا ہے اسی طرح ہی اس عورت کی کوئی ایک خواہش پوری ہوتی ہو۔ وہ کہہ رہے تھے اور وہ مستقل ان کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔ بھابھی چپ چاپ ان کے پائنتی بیٹھی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہے بھائی مجھے صرف آپ کا پیار چاہیے۔ ماریا کے کہے الفاظ اسے اپنی زبان پر بہت اجنبی محسوس ہوئے تھے جب تم چھوٹے تھے تو ہر وقت میرے کندھوں پر چڑھے رہتے تھے مجھے جہاں بھی جانا ہوتا تھا میرے ساتھ ہوئے۔ وہ کچھ پل کو خاموش ہوئے تھے ماضی کی کوئی خوب صورت بات یاد آئی تھی۔ کہ ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ چھا گئی تھی۔ جب پہلی بار تمہاری بھابھی کے گھر والے مجھے دیکھنے آئے اس دن بھی تم میرے کندھوں پر بیٹھے رہے اماں نے لاکھ ڈپٹا لیکن تم نہیں ہلے وہاں سے کبھی میرے بال بکھیرتے تو کبھی کان میں سرگوشیاں کرنے لگے سب ہنستے رہے لیکن تمیں احساس نہ ہوا اور جس دن میں دولہا بنا۔ تم شہ بالا بنے تھے گلے میں ہار ڈالے سارے باراتیوں میں شان سے گھومتے رہے شوق کا یہ عالم کہ گھر واپس آ گئے بھی ہار نہیں اتارے خالہ صفیہ نے ڈانٹ کر اتروانے چاہے مگر تم تو مرنے مارنے پر تل گئے۔ بیچ صحن کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے روئے تم خالہ صفیہ کے وہ بخئے ادھیڑے تم نے کہ وہ تو کان پکڑ کر توبہ توبہ کرنے لگیں۔ اور اماں کی تو ہنسی نہ رکتی تھی۔

تمہاری اس دیوانگی پر تم روتے جاتے تھے اور اماں ہنستی جاتیں بھائی کی باتوں پر اس نے اور بھابھی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ واقعی ایسے کہا تھا۔ میں پھر مجھے چپ کس نے کروایا۔ اس نے جھینپتے ہوئے پوچھا۔ تمہیں کون چپ کروا سکتا تھا بھائی۔ اماں نے خالہ سے کہا ہار واپس لا کے اسے پہنا دو۔ خالہ نے ایسے ہی کہا ہار گلے میں پہنچتے ہی تمہارا باجا بند ہو گیا۔ اور یہ ترکیب کامیاب رہی۔ اب کی دفعہ بھابھی نے ہنستے ہوئے بتایا آپ کو کیسے پتہ اس بات کا مجھے وہیں صحن میں ہی تو لا کر بیٹھایا گیا تھا سارا میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بچپن میں بھی کتنا احمق ہوتا ہے انسان وہ کھسیاتے ہوئے بولا۔ اماں بہت چاہتی تھی تمہیں بہت پیار کرتی تھیں تم سے وہ پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے بھابھی بھی اماں کا دوسرا روپ بن چکی ہیں۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مجھے تو اماں ہی کا عکس نظر آتا ہے ان میں اس نے مسکرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا آج بہت دن بعد وہ کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ اپنے اندر سے خوشی پھوٹتی محسوس کر رہا تھا۔

امیر آدمی کی زبان دھات کی بنی ہوتی ہے وہ جو لفظ بھی بولتے ہیں۔ وہ سونا بن کر نکلتا ہے اس کی ہر بات موتیوں کے برابر ہوتی ہے اس کا ہر

لفظ موتی، اس کی ہر سوچ موتی اور غریب کی زبان مٹی کی زبان ہوتی ہے وہ جو لفظ بھی بولتا ہے وہ مٹی بن کر نکلتا ہے لیکن وہ مٹی کے خوف سے بولنا تو نہیں چھوڑے گا اس کے خواب مٹی بنتے رہیں گے۔ لیکن وہ خواب دیکھتا رہے گا۔ غریب انسان تو سراسر غلط ہے بہت حسب حال سا ایک شعر ہے زندگی کچھ اس طرح سے گزری دانش جیسے بازار سے نادار گزر جاتا ہے کبھی ایسی بے بسی محسوس کی ہے تم نے تم بازار جاؤ۔ بہت کچھ لینا چاہو۔ لیکن خالی ہاتھ واپس آؤ۔ بازار میں دینا کی ہر چیز سجی ہو۔ اسے خریدنے کی تمہاری خواہش بھی شدید ہو لیکن اس خواہش سے کئی گنا شدید ی اذیت ہوتی ہے کہ آپ اسے خرید نہیں سکتے۔ خالی جیب کی آزیت انہیں بھڑکتی ہوتی آگ ہے جو آپ کو جلا کے راکھ کر دیتی ہے انے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا تھا۔ اسے کوئی ایسی خواہش کرنی ہی نہیں چاہے جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ ماریا نے سر جھکائے گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔ انسان کی خواہش اس کی دسترس میں نہیں ہوتی۔ اس نے بہت چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ماریا خاموشی سے اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ او کے میں چلتی ہوں وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ کبھی محسوس ہوتا ہے اسے مجھ سے بہت محبت ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے میں اس کی زندگی میں ہوں ہی نہیں اس کی زندگی میں سب سے پہلے پیسہ ہے بعد میں میں۔۔۔ کلاس روم میں پہنچنے تک پیریڈ شروع ہونے کے بعد تک وہ اس کی بات پر سوچتی رہی تھی۔

بیچ سڑک پر آ کے بائیک رک گئی۔ اس نے کوفت سے نیچے اترتے ہوئے ٹنکی چیک کی۔ بائیک میں پٹرول بالکل ختم ہو چکا تھا اور اس وقت اس کی جیب میں صرف پندرہ روپے تھے۔ پندرہ روپے کا پٹرول ڈیڑھ گھنٹے کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اسکی کوفت جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی۔ وہ بائیک کو گھسیٹ کر نزدیکی پٹرول پمپ تک لایا اور وہاں کے مالک سے بات کر کے بائیک وہیں کھڑی کرنے کے بعد وہ بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد بس کچہری روڑ پر رک وہ چھلانگ لگاتے ہوئے نیچے اترا۔ کچہری میں اس وقت خاصا رش تھا۔ وہ سیدھا کلرک آفس گیا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک پل کو تو وہ چکرا سا گیا تھ۔ یونیورسٹی سے سیدھا وہ یہیں آیا تھا اور اب بھوک اور پیاس سے اس کا برا داخل ہوتے ہی ایک پل کو تو وہ چکرا سا گیا تھا۔ یونیورسٹی سے سیدھا وہ ییں آیا تھا اور اب بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال تھا اپنے اوسان بحا کرنے کے لیے وہ دروازے کے پاس پڑی ہوئی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور نظریں کمرے کا طواف کر رہ تھیں جیسی کرسی پر وہ بیٹھا تھا بالکل ویسی ہی دو اور کرسیاں بھی دائیں دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔

دو پھٹے ک ہوئے فوم کی کرسیوں کے سامنے مٹیلا سبز رنگ غلاف والی لکڑی کی میز اور اس کے اوپر پڑے ہوئے لاتعداد بکھرے ہوئے کاغذات اور میز کی پچھلی دیوار پر لگی ہوئی قائداعظم کی تصویر جس پر جمی ہوئی مٹی کی دبیز تہہ اتنے فاصلے سے بھی واضح نظر آ رہی تھی۔ اسے جانے کیا سوجھی تھی۔ وہ ایک پل میں اٹھا اور اس تصویر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اسے نیچے اتار کر اپنی جیب سے رومال نکالا اور تصویر کے فریم کو صاف کرنے لگا تھا۔ آفس میں بیٹھے ہوئے دو کلرک حضرات نے بہت حیرانی سے اس کی اس عمل کو دیکھا تھا وہ تصویر کی گرد جھاڑ کر کرسی پر آ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ مجھے نور کہتے ہیں میں ایقان احمد کا بھائی ہوں اس نے ان کی حیرت دور کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں سے ہاتھ ملایا۔ آپ ان ہی کے بھائی ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک کلرک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ تصویر صرف وہ ہی صاف کیا کرتے ہیں حیرت انگیز

طور پر آپ دونوں بھائیوں کی عادتیں ملتی ہیں۔اس نے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے کہا۔ بات عادت کی نہیں محبت کی ہے اس نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کولا جواب کیا تھا۔ کسی طبعیت ہے اب ایقان صاحب کی۔

ان میں سے ایک کلرک نے کاغذوں کا پلندہ سمیٹتے ہوئے پوچھا ٹھیک ہیں۔ وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ جی ہمارے لائق کوئی خدمت۔ اس نے بہت پروفیشنل انداز میں پوچھا تھا۔ ایقان صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔تو ہم نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ اب آرام کریں۔ جی! اس نے ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اس سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔ وہ بیمار رہتے ہیں ڈیوٹی دے نہیں سکتے اب یہی سوچا ہے کہ اگر ریٹائرمنٹ لے لے جائے کیونکہ اب ان کی صحت کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ دیکھیں، قبل از وقت ریٹارمنٹ کے جھمیلے بہت ہوتے ہیں۔ اور پھر گریجو یٹی کا مسئلہ بڑا مشکل ہے وہ اسکی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ جی میں جانتا ہوں میں اپ لوگوں سے مشورہ کرنے ہی ایا تھا کہ کیا کرنا ہوگا۔ وہ ان دونون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ایک حل اور بھی ہے دوسرے کلرک نے پیپر ویٹ سے کھلتے ہوئے کہا۔ وہ کیا چونکہ انکی ریٹائرمنٹ میں ابھی کافی سال ہیں۔ گریجو یٹی تو یوں بھی مشکل ہوگئی گورٹ کچریوں کے چکر میں جتنا آپ سر کار پر لگادیں اتنا تو وہ آپ کو دے گی بھی نہیں۔

ہاں آدھی تنخواہ پر بات ٹھہر سکتی ہے۔ چونکہ وہ بیمار ہیں اور پھر قانونی طور پر ان کا حق بھی بنتا ہے اتنی تنخواہ گورنمنٹ سے انہیں گھر بیٹھے بھی مل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جہاں تک گریجو یٹی کی بات ہے وہ تو ریٹائرمنٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد ہی مل سکتی ہے وہ ان کی بات پر ہولے ہولے سر ہلا رہا تھا۔ اوکے سر مجھے اجازت ہے وہ ایک پل میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں سے ہاتھ ملاتا ہوا باہر نکل گیا۔۔

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی کن من اور ٹھنڈی ہواؤں نے اس حبس زدہ موسم کو خوشگوار و دلکش بنا دیا تھا سارا ڈپارٹمنٹ باہر گراونڈ میں جمع تھا۔ ساون کی پہلی بارش طالب علموں کے لیے جنت سے کم نہیں تھی۔ کم ہوتی بھی نہیں لیکن ماریا نے صبح سے ایک بار بھی قدم کلاس روم سے باہر نہیں نکالا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے میں تمہارا سر پھاڑ دوں۔ آئمہ نے قہرآلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ پھاڑ دو۔ اس نے بہت سکون سے جواب دیا تھا۔ آخر باہر نکلنے میں حرج کیا ہے تم پر تا نہیں اتنی مردہ دکیوں چھائی ہے میرا تو دل چاہ رہا ہے میں اڑ کے باہر پہنچوں وہ بچوں کی طرح پر جوش ہو رہی تھی۔ فضول خواہش نہیں کرتے تم لاکھ چاہے کے باوجود بھی اڑ نہیں سکتیں پھر خواہش کرنے سے فائدہ ماریان مسکر اکر گویا نمک چھڑ کا تھا۔

وہ مس ڈپارٹمنٹ باہر نور کے ساتھ بیٹھی ہے اور دونوں بارش میں بھیگ بھی رہے ہیں۔ آئمہ نے اپنی طرف سے اسے طیش دلا یا تھا۔ بھیگنے دو، اس کا سکون قابل دید تھا۔ ہاں بھگنے دو اگر ساون میں بھیگتے بھیگتے وہ دونوں پیار کی بارش میں بھیگنے لگے تو پھر سر پکڑ کر روتی رہنا۔ اس نے اپنی طرف سے مستقبل کا نہایت خوف ناک نقشہ کھینچا تھا مگر دوسر طرف ذرہ برابر پرواہ نہیں تھی۔ دل پشوری انسان کا پیدائشی ہے آج جی بھر کے خوش ہونے دو میرے محبوب کو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے دل پشوری کرنی ہے تو صرف تمہارے ساتھ کرنے کسی اور کے ساتھ کرے گا تو میں اس کا سر پھاڑ دوں گی۔ کیوں بھڑک رہی ہوا تنا۔ وہ میرے ساتھ دل لگا کر پچھتا رہا ہے کسی دوسری کے ساتھ یہ غلطی نہیں کرسکتا۔ سبحان اللہ۔ محبوب باہر رنگ رنگیلی تتلیوں کے بسنتی ملبوس دیکھ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرر ہا ہے اور تنہا کمرے میں بیٹھی محبوبہ کا اعتماد دیکھے۔ آئمہ نے

چڑ تے ہو کہا۔اخر کیا چاہتی ہو تم وہ اس کے انداز میں ہنستے ہوے بولی تھیں ۔ بننے کی کوشش مت کرو،ڈونٹ ٹرائی ٹو پوز وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوے بولی تھی ۔اچھا بابا تم جیتی میں ہاری ۔اب خوش وہ ہاتھ جوڑ کے اٹھتے ہوے بولی تھی ۔میں تمہیں ہرا کر خوش نہیں ہو سکتی ۔اس نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوے کہا تھا۔اور میں کیسے جیتوں گی ۔تم باہر آ ؤ اپنی جیت کا احساس تمہیں خود ہو جاے گا۔

اس نے معنی خیز لہجہ اپناتے ہوے کہا تھا۔او کے۔ہم بھی دیکھتے ہیں اپنی جیت کا مزہ۔وہ کرسی سے اٹھتے ہوے بولی تھی باہر ابھی تک بوندا باندی جاری تھی۔دروازے سے باہر نکلتے نکلتے وہ دوبارہ رک گئی۔بارش ہو رہی ہے آئمہ اسے اپنی طرف گورتے پا کر وہ منمنائی تھی۔تو کون سی قیامت آ گئی ہے۔وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر باہر نکلتے ہوے بولی تھی۔گراونڈ میں کیچڑ ہو رہی تھی۔مگر پرواکس کو تھی۔کوئی چہل قدمی کر رہا تھا تو کوئی گھاس پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا فرینڈ شپ روڈ تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں اچھی خاصی بھگ چکی تھی غلطی کی ہے ہم لوگوں نے ہمیں باہر نہیں آنا چاہے تھا۔ماریا نے اپنا دوپٹہ پھیلاتے ہوے کہا۔غلطی پر پچھتانا بے وقوفی ہوتی ہے۔آئمہ نے کلستے ہوے کہا۔وہ دیکھو۔وہاں آئمہ نے چلتے چلتے ہاتھ سے اشارکرتے ہوے اسے کچھ دکھایا تھا۔کہاں اس نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوے پوچھا۔وہاں لائبریری کی سیڑھیوں پر نور اور اکمل کا گروپ بیٹھا ہے اگر نور تمہیں دیکھ کر تمہاری طرف آ گیا تو سمجھو جیت تمہاری ۔اگر وہ مجھ دیکھ لینے کے باوجود میری طرف نہ آیا تو اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

لیکن تمیہں تو اپنا پیار پر بہت اعتماد ہے وہ اس کے خدشے پر حیران ہوتے ہوئے بولی تھی ۔اعتماد تو ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ہر وقت ہمارے پلو سے بندھا رہے دیکھو ناں اپنے بھی ہزار کام ہوتے ہیں انسان کو اس نے ہسنتے ہوے کہا۔یہ باہر نکلتے ہی تمہارے نظریات کیوں بدلنے لگے۔آمنہ نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوے اسے ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوے پوچھا۔تم بھی تو سیدھا سیدھا چیلنج پر اترائی ہو۔وہ اس کی کمر پر دھپ لگاتے ہوے بولی تھی۔اب یہاں سے نکلو جلدی کم از کم سامنے برآمدے تک تو پہنچو بارش تیز ہونے لگی ہے وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوے بولی۔اب ایک منٹ کے لیے نہیں رکنا۔تیز تیز چلو۔آئمہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر خود کو اور اسے تقریباََ دوڑانے لگی تھی۔اور وہ اس کا ہاتھ پکڑے بارش سے بچنے کے لیے اسی رفتار سے دوڑتی رہی۔تیز دوڑنے کی وجہ تھی یا مسلسل برستی بارش اسی پل اس کا سانس اکھڑا تھا آئمہ کے ہاتھ میں تھمے اس کے ہاتھ کی گرفت یک لخت ڈھیلی پڑی تھی۔اس کے ہاتھ کی بے جان گرفت کو محسوس کرتے ہوے ہی آئمہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا جو خطرناک حد تک زرد پڑتے چہرے کے ساتھ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ماریا اس کی کانپتی ہوئی آواز ابھری لیکن ماریا اپنے سینے کو مسلتے ہوے زمین پر گر چکی تھی۔دوسرے ہاتھ سے اس نے بمشکل سانس بند ہونے کا اشار دیا تھا۔اس قدر غیر متوقع خوفناک صورت حال تھی ک آئمہ کی آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔

اس نے خوف سے پھٹی ہوئی آواز میں سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوا سے پکارا تھا۔نور نور،وہ پاگلوں کی طرح اسے پکار رہی تھی۔کئی لڑکے اور لڑکیوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور مدد کے لے بھاگے تھے۔پاکستان کے امیر عوام پر بحث کرتے ہوے اس کے کانوں میں اپنے نام کی پکار گونجی تھی۔اس نے یک دم پیچھے دیکھا تھا اور پھر جسے سن کر ہو کر رہ گیا تھا۔گراونڈ کے بیچوں بیچ آئمہ نہایت خوفزدہ حالت میں کھڑی تھی

اوراس کے قریب ماریا اس برستی بارش میں ٹھنڈی گھاس پر بالکل چت پڑی تھی۔ آس پاس لوگوں کا بڑھتا ہوا ہجوم وہ ایک لمحے میں اس خوفناک سچویشن کو سمجھ گیا تھا۔ اپنے اردگرد دیکھے بغیر وہ پاگلوں کیطرح اس طرف دوڑا تھا۔ نور! ماریا! وہ اسے دیکھتے ہی بلکنے لگی تھی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا وہ اس پر سر پچھتاتے ہوئے بمشکل کہہ پایا تھا ماریا اس نے گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے پکارا تھا جس کی رنگت سانس کھینچے کی کوشش میں نیلی پڑ چکی تھی۔ ماریا اس نے بار اس کا گال تھپتپایا لیکن اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھی۔ اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور مسلسل اپنے دونوں پاؤں زمین پر مار رہی تھی۔ نور امیں گاڑی نکال رہا ہوں تم ماریا کو لے کر فوراً باہر آؤ۔ اکمل نے ایک سیکنڈ میں صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ ہاں میں لا رہا ہوں آئمہ تم کلاس روم سے اس کا بیگ لے کر آؤ۔ آس نے ماریا کو اپنی بانہوں میں اٹھاتے ہوئے آئمہ کی طرف دیکھا۔ آئمہ نے کلاس روم کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں آٹھا کر گرؤنڈ پار کر چکا تھا۔ جب آئمہ بیگ لے کر پہنچی تھی۔ کھولو اسے اسے آتے دیکھ کر وہ تیزی سے بولا۔ آئمہ نے ایک سیکنڈ میں سارا بیگ الٹ دیا۔ کتابیں پیپرز اور پین کے علاوہ اور کوئی چوتھی چیز بیگ سے نہیں نکلی تھی کیا ماریا ان ہیلر ساتھ نہیں لاتی۔ اس نے بیگ سے نکلی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا کبھی کبھار لاتی ہے وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی اوہ مائی گاڈ، وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھا۔ آئمہ بھی چیزیں واپس بیگ میں ڈالتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑی تھی ان لوگوں کے باہر آنے تک اکمل گاڑی پارکنگ سے نکالنے کے بعد اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ماریا کو پچھلی سیٹ پر لٹانے کے بعد وہ تیز لیسے فرنٹ سیٹ پر اکمل کے برابر اکر بیٹھا آئمہ کے پچھے آ کر بیٹھے ہی گاڑی تیزی سے باہر روڈ پر نکلی تھی۔ ہاسپٹل یا کلینک، اکمل نے نور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ہاسپٹل۔ اس نے فکرمندی سے پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

اکمل نے گاڑی ہاسپٹل روڈ کی طرف موڑ دی تھی۔ ماریا تم ٹھیک ہونا۔ آئمہ اس پر آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔ ہاں اس کی ہلکی سی آواز نور کے کانوں میں اتری تھی اس کا سانس ٹوٹ کر نکل رہا تھا آئمہ کی گود میں رکھے ہوئے اپنے سر کو وہ مسلسل دائیں بائیں مار رہی تھی۔ آئمہ اپنے بہتے انسوؤں کے درمیان بار بار اپنی گود میں رکھی اس کی پیشانی چوم رہی تھی۔ کلینک کے سامنے گاڑی روکتے ہی وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے ڈاکٹر نے چیک اپ کے فوراً بعد اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے سانس بحال کرنے کے لیے ان ہیلر لگا دیا تھا۔ سانس کی رفتار چیک کرتے ہوئے ڈاکٹر نے سر اٹھا کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔ بیٹھ جائیں آپ لوگ۔ انہوں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ان تینوں کو بھی بیٹھنے کا اشارا کیا۔ اب کیسی طبیعت ہے اس کی۔ نور نے بیڈ پر پڑے اس کے وجود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا ان ہیلر لگا دیا ہے۔ اب طبعیت سنبھل جائے گی دمہ کے مریض کو ہر لمحہ ان ہیلر اپنے پاس رکھنا چاہے لاپروائی میں اپنی ہی جان کا نقصان ہے میں نہیں سمجھتا کہ ایک پڑھا لکھا انسان اتنی غیر زمہ داری کا ثبوت دے۔ ایسے مریض کا کیس بھی وقت کسی بھی جگہ سانس اکھڑ سکتا ہے نرس انجکشن لگانے کے لیے آئی۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس طرف گے۔ وہ بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے ان کے پیچھے گیا۔ بازو میں سوئی چھبنے سے وہ ذرا سا کسمسائی تھی۔ انجکشن سخت تھا اس کے بازو پر اس جگہ ہلکا سا نیلا نشان بن گیا تھا وہ بغور اس نشان کو دیکھنے لگا۔ اب ہم انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔

اکمل نے پوچھا جی ہاں اب یہ بہتر ہیں آپ لوگ گھر لے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنے پروفشنل انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ تھینک یو

جواباوہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھائے۔ وہ دونوں بیڈ کے پاس کھڑے اس آہستہ آہستہ باتیں کرر ہے تھے۔تھینک گاڈ، آج تو مروادیا تھا تم نے ہمیں۔اکمل نے اسے صحیح حالت میں دیکھتے ہی سکون کا سانس لیا۔ایک تو مجھے لگا کہ بس اب کہانی ختم ماریابی بی تو خدا حافظ کہہ گئی تھی ہمیں۔اس کی بات پر وہ زرا سا مسکرائی تھی۔جبکہ نور نے اسے سخت نظروں سے گھورا تھا۔اور کل کوئی ضرورت نہیں یونیورسٹی آنے کی کچھ دن ریسٹ کرواور ودوا وقت پر کیوں نہیں کھاتی ہوتم ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ یہ سب لاپروائی کا نتیجہ ہے اوران ہیلر ساتھ کیوں نہیں لاتی ہوتم اس قدر غیر زمہ داری کا ثبوت دیا ہے تم نے جی چاہ رہا ہے ایک تھپڑ لگاؤں تمہیں اسے صحیح حالت میں دکھ کر غصہ دکھانے کو جی چاہنے لگا تھا وقت پر ہی کھاتی ہوں۔اس کی اتنی لمبی بات کے جواب میں اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔اگر وقت پر کھاتیں تو یہ حال ہوتا آئمہ کی بھی جان میں جان آئی تھی۔چلو آؤ مجھے میڈیکل اسٹور سے دوائیاں بھی لینی ہیں۔تم لوگ نکلو اکمل آؤ۔وہ اکمل کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔اپنی بیماری کے بارے میں بات کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھااور نور سے اپنی بیماری ڈسکس کرنا اسے سخت آکورڈ لگ رہا تھا اس سے کچھ چھپا ہوا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے ساتھ اس مسئلے پر کبھی بات نہں کرتی تھی اب بھی وہ اس بات کو ختم کرنا چاہ رہی تھی۔

ایڈریس بتاو گھر کا۔اکمل نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔آخری منٹ اسٹاپ نمبر 2 اس نے آہستہ سے بتاتے ہوئے سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائی تھی۔نور نے اس کے لہجے کی کمزوری کو محسوس کیااور پھر اس بارے میں مزید کچھ بھی نہ پوچھنے کا ارادہ کرتے وے باہر سڑک پر نظریں جمادیں۔

جی آج کیم ہے اور جب تک بھائی کی ریٹارمنٹ کی مدت پوری نہیں ہوجاتی یہ آدھی تنخواہ اس گھر میں آتی رہے گئی۔اس نے کولر میں سے پانی کا گلاس بھر کر منہ سے لگایا اور اک ہی سانس میں ختم کر دیا۔تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے ایک ہی سانس میں پانی مت پیا کرو سانس اٹکنے لگتی ہے بھابھی نے اسے ٹوکا تھا جی بہتر اس نے اپنے مخصوص اندازمیں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ان کی بات پر اس کا دھیان کسی کی سانس میں اٹکنے لگا آج کتنے دن ہوگے۔وہ نہیں آئی پتا نہیں کیسی ہوگئی۔آئمہ آج بتا رہی تھی کہ اب وہ ٹھیک ہے لیکن ابی نقاہت کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں اسکتی۔ کتنا دل چاہ رہا ہے اسے دیکھنے اس سے ملنے کو اس سے بات کرے کو اب جب وہ آے گی تو میں اس کہوں گا کہ میں نور اس سے محبت کرتا ہوں بے تحاشا محبت اور یہ بھی کہ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں بالکل ویسے ہی جیسے خوش رہتی ہے اور جیسے شائستہ بقول ماریا کے مس ڈپارٹمنٹ وہ اپنی سوچ پر خود ہی ہنسا اور یونہی ہنستے ہوے اس نے چھوٹے سے باروچی خانے پر چاروں طرف نظر دواڑئی تھی اور چولھے کے سامنے ہوئی پیڑھی پر اچانک مریم آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی دیوانگی پر بہت حیران ہوا تھا پنل بھابھی کے اچانک اندر آکر پکارا تو وہ چونک کر پلٹا جی اماں کیا بات ہے بھوک لگ رہی ہے اس کی کچن میں موجودگی سے وہ یہی سمجھی تھیں۔ہاں نہیں یونہی پیاس لگ رہی تھی اب تو پیاس بھی نہیں ہے وہ سامنے پڑی پیڑھی پر نظریں جماتے ہوے بولا تھا۔

تمہاری طبعت تو ٹھیک ہے۔بھابھی نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔بالکل پرفیکٹ وہ بشاست سے مسکرایا۔تو یہ مسلسل پیڑھی کی طرف کیا دیکھرہے ہیوہ کرید رہی تھی نہین تو میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ آج گھر میں خاموشی بہت ہے اس نے گردکھجاتے ہوے کہا یہ خاموشی

تو ہمیشہ سے ہے وہ ابھی تک مشکوک تھیں۔ کیاخیال ہے کیوں نہ اس خاموشی کوتوڑ دیا جائے کسی خیال کے آتے ہی وہ شرارت سے مسکرائیں۔ کس طرح وہ حیران ہوا۔تمہاری شادی کر کے۔ کیا!میری شادی لیکن میرا تو ابھی چھ سات سال تک ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔کس کادماغ خراب ہے بھائی نے کمرے س نکلتے ہوئے پوچھا۔پنل اور کس کابھابھی پلٹ کران کی طرف دیکھتے ہوئے کہ ن رہے ہیں کیا کہہ رہے کہتا ہے۔

چھ سات سال تک شادی نہیں کروں گاوہ تو یوں خفا ہو رہی تھیں جیسے بارات تیار کھڑی ہو وہ جو کہتا ہے کہنے دوتم اپنے دل کی کرو۔ بھائی نے ان کی ہمت بندھائی تمہارے دل کی فکرہی تو کر رہے ہیں بھابھی نے مسکراتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھامیرے دل کی فکروہ گڑبڑا گیا تھا۔ ہاں تمہیں جو یہ ہروقت گھر کی خاموشی ستانے لگی ہےتو ہم نے سوچا جی نہیں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھااس نے کھیساتے ہوئے ان کی بات کاٹی اور کمرے سے گاؤتکیہ لاکر بھائی کی کمرے کے پیچھے رکھتے ہوئے خودبھی ان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے کچھ بننا ہے سب سے پہلے تو اپنا ایک خوبصورت سا گھر بنانا ہے جسے اماں اپنی مرضی سے سجائیں گئ۔جس کی اک ایک دیوارمیری ماں کی ملکیت ہوگئ اور جس کی دیواروں کی سفیدی جھڑنے سے مالک مکان خوف نہیں ہوگااور دوسرے نمبر پر مجھے اپنی ایک ذاتی اکیڈمی بنانی ہے جس کے ماتھے پر ایقان ایکڈمی کابورڈ ہوگا۔وہ اپنے خوابوں کوزبان دے رہا تھااور بھائی بغوراس کاچہرہ دیکھ رہے تھے۔

گھراپنی ماں کے لیے بنواؤگے اکیڈمی میرے نام پر رکھوگے۔اپنے لے کیا کروگے میں دنیا کا ہرکام آپ دونوں کے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ کسی جذبے کی لواس کی آنکھوں میں دمکنے لگی تھی دیکھ رہے ہیں اسے۔بھابھی نے شکایتی انداز میں شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا دیکھ رہا ہوں کتنا بڑا ہوگیا ہے ناں پنل ہماری آنکھون سے خواب اب اس کی آنکھوں میں سجنے لگے ہیں وہ تعبیر جو ہمیں مل نہیں سکی۔وہ تعبیر خواہش بن کر اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہے جب تک اس کی خواہش مجسم تعبیر نہں بن جاتی۔اسے راستے میں مت روکنا آدھے راستے میں رکا ہوانسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا اور میں اسے ایک کامیاب انسان دیکھنا چاہتا ہوں ایک ایسا انسان جوحسرت کے لفظ سے بھی ناآشنا ہو یہ میری زندگی کی واحد خواہش ہے یہ بات کہتے ہوئے ان کی آنکھیں کی دیے کی طرح روشن ہو رہی تھی۔

اس نے ایک بہت خاموش نظر بھائی کے چہرے پرڈالی اوراپنی خواہشات کے ڈھیر کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ آج بہت دنوں بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ جہاں فئیر ویل پارٹی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔جس کا اندازہ اسے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ہوگیا تھا۔ پہلے پیریڈ کے بعد سے ہی وہ سب باہرلان میں بیٹھے اسی فنکشن کوڈسکس کررہے تھے۔ ماریا ایک فرمانبردارلڑکی ہے اکمل نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ کیسے آئمہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔کیونکہ اس دن نور نے کہا تھ کہ تمہیں اب کافی دنوں تک یونیورسٹی آنے کی ضرورت نہیں آپ لوگ اسی بات سے اس لڑکی کی انتہا درجے کی فرمانبرداری کا اندازہ لگا سکتے ہیں اس نے کولڈ ڈرنکس کے گلاس سب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہاماریا اس کی بات پر بری طرح جھنیپ گئ تھی۔جبکہ نور کے چہرے پرایک جان دار مسکراہٹ کھل گئ تھی۔ جی نہیں اسی بات نہیں تھی۔وہ اپنی جھنیپ مٹاتے ہوئے بولی۔جی نہیں ایسی ہی بات تھی۔وہ اپنے اندازے پر قائم تھا۔نور نے بہت خاموشی سے ٹرے میں سے گلاس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اٹھایا تھا اور اس میں سے برف کے کیوبز نکال کر گلاس ماریا کی طرف بڑھا دیا تھا۔اس کے اس قدر خیال اور احتیاط پر ماریا نے تشکر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گلاس تھام لیا۔فنکشن کب ہو رہا ہے میں بھی حصہ لینا چاہتی ہوں۔تم لوگوں کی کای پلاننگ ہے ماریا نے کہا بھئی میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے میں تو س سج بن کر آ ؤ گی اور ہال کی فرنٹ سیٹ پر جا کر بیٹھ جاؤں گی دو سال تک بہت کام کیا ہے۔

ہم نے اب مزید ہمت نہیں آ ئمہ نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔میں بھی ماریا سے اتفاق کرتا ہوں۔اکمل نے بھی آ ئمہ کی تائید کی۔یہ دو سالوں میں پہلا موقع ہے کہ تم دونوں کسی ایک بات پر متفق ہوئے ہو۔نور کی ان دونوں پر اتفاق پر حیرت ہوئی۔ان دو سالوں میں آ ئمہ نے پہلی عقل کی بات کی ہے۔اکمل کی بات پر آ ئمہ نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اس کے سر پر ماری تھی۔میں جارہی ہوں عقل کل وہ تنتاتی ہوئی اٹھی۔سنو، وہ شرارت سے اسے پکارتے ہوئے پلٹا، بابر علی کا فون آ ئے تو اسے میرا اسلام کہنا۔اس کے لہجے کی شرارت کی محسوس کرتے ہوئے اس نے پاس پڑے ہوئے پتھر کو زور سے ٹھوکر ماری تھی یوں جیسے اس کی بات کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا کبھی کبھی بہت زیادتی کر جاتے ہو تم بے چاری کے ساتھ اسے دور جاتا دیکھ کر نور نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔جواباً وہ بھی مسکرایا مگر اس کے اعتراض پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔سیمنار ہال جا رہا ہوں چل رہے ہو اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا ہاں تم چلو میں آ رہا ہوں اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔اور اس کے چلے جانے کے بعد وہ بہت خاموشی سے کش پر کش لگاتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

یہ کیا پنجابی فلموں کے ولن کی طرح مجھے گھور رہے ہو تم اس کے ٹوکنے پر اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور دوبارہ اسے بغور دیکھنے لگا۔جس پر اس نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔ جلتے ہوئے سگریٹ کو پیروں تلے مسلتے ہوئے وہ اپنی ایک بات کہوں ماریا۔اس ک لہجہ بہت گمبھیر تھا گیا۔ماریا کی نظریں جھک گئیں تم مجھے بہت عزیز ہو ماریا! وہ دل سے اپنی محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔اس کی خوشبوس ماریا کا پور پور مہک اٹھا یہ دو سال کتنی جلدی بیت گے تمہیں یاد وہ دن دو سال پہلے جب ہم پہلی بارے ملے تھے۔میں وہاں لائبریری کے دروازے کے باہر کھڑا تھا اور تم جنرل افس کے باہر لگی لمبی لان میں کھڑی ہر ایک کے فارم نہایت خوشی دلی سے جمع کروا رہی تھیں۔اور میں دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھ جسے نہ دھوپ کی پرواتھی نہ گرمی کی جو بہت خوش دلی سے ہر ایک کا فارم پکڑتی تھی اور دوبارہ سے قطار میں کھڑی ہو جاتی تھی وہ کوئی پچھلی بات یاد کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

پھر جانتی ہو میں نے کیا کہا تھا نور نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا سب یاد ہے مجھے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ مجھے وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔جسے خود سے زیادہ دوسروں کے آرام فکر کی تھی۔پھر میں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت لائبرری کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور میں نے تمہارے پاس آ کر کہا۔پلیز میرا فارم بھی جمعل کروا دیجے میرے سر میں بہت درد ہے اور بخار بھی ہو رہا ہے یہ بات کہتے ہوئے میں نے انتہائی لاچاری شکل بنائی تھی اور تم نے فارم میرے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا دیکھتے میں تو بھلے چنگے لگ رہے ہیں آپ اور پھر واپس جنرل آفس بڑھ گئیں تھیں اور جب تم فارم جمع کروانے کے بعد واپس آئی تھی تو میرے شکریہ ادا کرنے پر تم نے کہا تھا یہ میرا فرض تو نہیں تھا لیکن میں نے ادا کر دیا ہے تمہاری اس بات پر میں نے قہقہہ لگایا تھا جس پر تم مجھے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔حیرت ہے تم ایک بات بھی نہیں

بھولے وہ حیرانی سے بولی تمہارے متعلق اورتم سے وابستہ کوئی بھی بات میں کبھی بھی نہیں بھول سکتا اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوے کہا۔اور جوتم مجھے ہی بھول گے تو کس خدشے نے سر اٹھارا ایسا کبھی نہیں ہوگا۔اس نے مضبوط لہجے میں کہا زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم کبھی نہیں سوچتے لیکن وہ ہو جاتی ہیں۔اس نے جھکے سر کے ساتھ بہت آہستگی سے کہا۔کیا تمہین مجھ پر اعتماد نہں ہے اس نے اس کی بات پر جیسے دکھ سے پوچھا۔مجھے تم پر اعتماد ہے اس نے بڑی خود اعتمادی سے سر اٹھا کر کہا تو وہ مسکراتا ہوا اٹھا کھڑا ہوا تھا۔

ہر جمعرات کو سیمنار ہوتا تھا جس میں اردو ادب اور ڈرامے پر مکالمہ پڑھا جاتا تھا آج کا ڈرامہ انارکلی تھا۔ہر دفعہ کی طرح مکالمے کے اختتام پر سر نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ انارکلی کس کا المیہ ہے سب کے یے ایہ ایک چھوٹا سوال تھا۔مگر اس کا جواب کسی کے پاس بھی اچھوتا نہیں تھا سب کے ذہنوں میں ایک ہی نام تھا مگر سر کا یہ کہنا کہ یہ اکبر کا المیہ ہے سب کو حیران کر گیا۔اکبر کا المیہ وہ کس طرح یہ اکبر کا المیہ کیسے ہوسکتا ہے سر یہ کیسے ممکن ہے کلاس کے ہونہار اسٹوڈنٹ حسن علی نے اٹھتے ہوے پوچھا تھا۔جواب میں سر کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ تھی۔کیونکہ اس سارے واقعے سے اکبر کے ساکھ متاثر ہوئی تھی وہ برصغیر میں اکبر اعظم کے نام سے جانا جاتا تھا۔اس کے قابل سپوت ایک کنیز کی وجہ سے نافرمانی پر اتر آیا۔حکم بدنام ہوئی۔بادشاہ کے پایے استقلال میں لغزش محسوس کی گئی کہ لوگوں کے دلوں سے اس کی عزت کم ہونے لگی عوام،میں چہ مگیو ئیاں ہونے لگیں اکبر عظیم کا بیٹا اور نافرمان شہزادے کی مظلومیت لوگوں کا دل پسیج گیا۔اکبر اعظم لوگوں کے نظروں میں جابر حکمران بن کر رہ گیا کسی بھی حکمران کے یے سب سے بڑی شکست ہی یہی ہوتی ہے کہ اس کے عوام اسے جابر کے نام سے پکارنے لگیں لہذا المیہ تو اکبر ہی کا ہوا سر نے تمام لوگوں کی طرف دیکھتے ہوے اپنی بات ختم کر اور کہا اگر کسی کو میری بات سے اختلاف ہے تو وہ دلائل دے۔

ساری کلاس میں ہلچل سی مچ گئی۔سر مجھے آپ کی بات سے اختلاف ہے سب سے پہلی لائن میں بیٹھے نور نے اپنے سیٹ سے اٹھتے ہے ہو بہت اعتماد سے کہا تھا امتیاز علی تاج کا کردار انارکلی اگر المیہ ہے تو بس اپنے پیاروں کے لیے۔ی المیہ ہے تو اس کی ماں کا یہ المیہ ہے تو اسکی بہن کا جو اپنی عزیز از جان ہستی کو گنوا بیٹھیں یہ المیہ ہے تو خود انارکلی کا کہ جسے محبت جیسے جرم کی پاداش میں زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا۔اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بادشاہ کے محل کی ایک غریب کنیز تھی۔جو اپنی اوقات بھول کر شہزادے سے محبت کرنے کی جرم کی مرتکب ہوئی۔جس کی خوب صورتی جس کی جوانی بھی اس کے کسی کام نہیں آئی اس نے محبت بھی کھوئی اور زندگی بھی نور کی بحث کے جواب میں سر کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی۔برخوردار مصنف نے چونکہ اس کردار کو مظلوم میں پیش کیا ہے اس لیے یقیناً قاری کی ہمدردیاں اس کے ساتھ گئ۔سر نے مسکراتے ہوے کہا تھا۔سر ہم اتو انارکلی کو امتیاز علی تاج کی وجہ سے جانتے ہیں اب یہ کردار سچا ہے یا جھوٹا یہ خارج از بحث ہے بات اس دکھ کی ہے اس میں کس کے لیے کتنی شدت ہے جس کی شدت زیادہ ہوگی المیہ بھی اسی کا بنا۔وہ بدستور اپنی بات پر قائم تھا چھوڑو یار تم نے کیا ایک لڑکی کی وکالت شروع کردی ہے خواہ مخواہ باپ بیٹے میں پھوٹ ڈلوادی۔اس زن نے ہر جگہ سے مسلہ ہی پیدا کیا ہے کم از کم میں تو سر کی بات سے متفق ہوں آخری لائنوں میں بیٹھے ہوے نجم ملک نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوے کہا تھا۔یہ پسلی سے نکلنے والی ایک فتنہ ہے اور کچھ نہیں پیچھے سے کسی اور کی آواز آئی تھی۔اگر پسلی سے نکلنے والی فتنہ ہے تو خود ع سوچے پسلی والا کیا چیز ہوگا۔شائستہ نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوے اپنے مخصوص پر اعتماد

انداز میں چنگاری چھوڑی تھی کلاس میں موجود تمام لڑکیاں نے زوردار تالیاں بجائی تھیں جبکہ مرد حضرات خاص جز بز ہونے تھے کلاس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

سر نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گے کہ اس مسئلے پر بحث کل ہو گئی۔ شائستہ ابھی تک لڑکیوں سے داد وصول کر رہی تھی آئمہ نے تو با قاعدہ اسے مبارک بادی دی۔ کیسا رہا آج کا مکالمہ نور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اچھا رہا لیکن سر متفق نہیں ہوئے اس نے فائل میں رکھے پیپرز نکال کر بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہوں اس نے پر سوچ انداز میں ہوں کہا تھا اچھا اگر مجھ سے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو کہو پھر مجھے اپنے ایک ضرور کام سے جانا ہے اس کی آفر پر وہ ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔ مجھ سے یہ تاری ادب کے نوٹس نہیں بن رہے کچھ ہیلپ کر دو پلیز پھر جہاں جی میں آے جانا۔ اس کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔ یعنی تمہارا کام کر دوں پھر بھلے سے بھاڑ میں جاؤں۔ اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ بھئی تمہاری مرضی ہے میں تمہیں وہاں جانے سے روک تو نہیں سکتی اس کی بات کی جواب میں نور نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپیت لگائی تھی۔

ایگزام شروع ہو گے تھے پہلے پیپر والے دن وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی ابھی پیپر شروع ہونے میں تھوڑا وقت تھا وہ باہر برآمدے میں ٹہل ٹہل کر رٹے لگا رہی تھی آج منہ دھو کر نہیں آئی ہو کیا۔ تمہارا رنگ تو یوں فق ہو رہا ہے جیسے خدا نخواستہ قیامت آنے والی ہو۔ وہ کب سے اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا تھا۔ قیامت سے کم بھی نہیں اس نے مستقل ٹہلتے ہوئے کہا تھا۔ پہلے پڑھ لیا ہوتا تو اب ایگزم قیامت کی طرح نہ لگتے۔ اس کی بات ماریا نے منہ پھلا لیا۔ یہ وقت طعنہ دینے کا نہین ہے مدد کرنے کا بھی نہیں ہے وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ سنو اگر میں پیپر میں کچھ نہ نہ کر پائی تو دل کا خدشہ زبان پر آ گیا۔ تو کوئی بات نہیں اگلے سال پھر دے لینا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔ وہ چڑ گی جھوٹ موٹ کی تسلی دینے سے فائدہ ویسے تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہوا ایگزامز کو ہوا بنا لیا ہے تم نے امتحان زندگی موت کا مسئلہ نہیں ہوتے۔ ٹیک اٹ ایزی یار، مجھے لگتا ہے تم نے آج ناشتہ بھی نہیں کیا۔ وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ ہاں میں واقعی ناشتہ نہیں کر کے آئی۔ دل نہیں چارہ رہا تھا گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے صاف گوئی سے کہا تھا چہ چہ چہ تم اتنی نکمی تو نہیں ہو پھر گھبراہٹ کس بات کی ہے ان دو سالوں میں تمہارا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے خود کو اس قدر کمزور مت سمجھو۔ تم کمزور نہیں ہو بہت بہادر ہو۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ میں بہادر ہوں یہ کس نے کہا اسے حقیقتا اچنبھا ہوا تھا میں کہہ رہا ہوں کیا اتنا کافی نہیں کم از کم دو بندوں کو گواہی ہونی چاہے۔ کس ایک شہادت پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے بولی تھی جب دو بندوں کی گواہی کا وقت آے گا تو وہ بھی دے لیں گے اس کی شرارت پر اسے اپنے کہے گے الفاظ کا احساس ہوا تھا میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا کہہ رہے ہو اتنا ڈر لگ رہا ہے مجھے اور تمیں ذرا بھی خیال نہیں وہ اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے بولی تھی۔

خیال ہی تو کر رہا ہوں تمہارا ہاں یاد آیا جس کام سے آیا تھا وہ تو میں بھول ہی گیا ایک بات کہنا تھی تم سے وہ اپنے اصل موضوع کی طرف آیا تھا کیا میں چاہ رہا تھا کہ تم ایگزامز کے بعد میری اکیڈمی میں اپلائی کر دو۔ کیونکہ جونیز کلاسز کے مقابلہ میں سینئر کو پڑھانا آسان ہوتا ہے اور

اکیڈمی کو نئے اسٹاف کی ضرورت بھی ہے اگلے ماہ کے اینڈ میں انٹرویوز اسٹارٹ ہورہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تم بھی انٹرویو دے دو۔ ہاں دیکھوں گئی۔ وہ اماں سے پوچھے بغیر ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی تھی۔ ایسا کرو، تم مجھ سے اکیڈمی کا ایڈریس لے لو شاید ایگزامز کے دوران ہماری ملاقات نہ ہو تم ایگزامز کے بعد اس ایڈریس پر پہنچ جانا اور خدا کے واسطے گھبرانا نہیں میں تم سے پہلے وہاں موجود ہوں گا۔ اس نے ایک پیپر پر ایڈریس لکھتے ہوئے کہا وہ خاموش رہی۔ آئمہ تیز تیز قدموں سے اسی طرف آرہی تھی۔ تھینک گاڈ ابھی پیپر شروع نہیں ہوا اتنی تیز تو گھوڑا بھی نہیں دوڑتا ہوگا جتنی تیزی سے میں یہاں تک پہنچی ہوں ان دونوں کو ابھی باہر ہی کھڑا دیکھ کر اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ چلو یک و شد و د شد نور نے مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

پتا ہے کیا ساری رات میں خواب میں یہی دیکھتی رہی کہ میرے پہنچنے سے پہلے ایگزامز شروع ہو چکا ہے اور ایگزامز نے مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ وہ انتہائی بچکانہ انداز میں اپنی سہیلی کو خواب سنا رہی تھی تم لوگوں کے انداز سے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میٹرک کے پیپر دے رہی ہو چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں ہمیں دیکھو کتنے مطمئن ہیں اکمل نے نور سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا وہ ابھی وہاں آیا تھا۔ ماریا وہ کل کون سی آیت بتائی تھی۔ تم نے جو پیپر پر پڑھ کر پھونکنی تھی۔ اس نے اکمل کی طرف سے پیٹھ موڑتے ہوئے کہا اس بار تو ان دونوں کا قہقہہ زوردار تھا۔

پیپرز ختم ہونے کے چند دن بعد وہ اکیڈمی جا کر انٹرویو دے آئی اور کچھ ہی دن میں لیڑ اسے مل گیا۔ اب پچھلے ایک ہفتے وہ باقاعدگی کے ساتھ اکیڈمی جا رہی تھی۔ اسے بی اے کے اردو لٹریچر کی کلاس ملی تھی۔ اس لیے وہ بہت شوق اور لگن سے پڑھا رہی تھی۔ اور پھر نور قدم قدم پر اس کے ساتھ تھی۔ اب اسے شدت سے رزلٹ کا انتظار تھا تاکہ وہ جاب کے لیے اپلائی کر سکے یہ ایک ایسا خواب تھا جو وہ کئی برسوں سے دیکھ رہی تھی آج اکیڈمی سے واپسی پر نور نے اس سے یہی سوال پوچھا تھا۔ رزلٹ کے بعد کیا پلان ہیں تمہارے کسی اسکول میں اپلائی کروں گی کیونکہ ٹیچنگ کے علاوہ مجھے کوئی اور شعبہ سوٹ نہیں کرتا اور شاید اماں بھی راضی نہ ہوں۔ اس نے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے کہا تھا۔ یہ ان آٹھ دنوں میں پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں واپسی پر اکٹھے اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ وجہ نور کی بائیک کی خرابی تھی۔ ورنہ تو وہ ماریا کے باہر نکلنے سے پہلے ہی جا چکا ہوتا تھا تم تھک جاؤ گی ماریا پہلے اسکول پھر اکیڈمی کیسے مینیج کرو گی تم ان دونوں کو اس کے لہجے سے اس کے لیے فکرمندی واضح تھی۔ جیسے تم تم بھی تو کرتے ہو یہ سب کچھ کیا تم تھکتے ہوئے اس نے جواباً کہا تھا۔

میں مرد ہوں۔ مجھے تو یہ سب کرنا ہے لیکن تم عورت ہو۔ یہ ذمہ داریاں تم پر لاگو نہیں ہوتیں اور پھر تم وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور پھر میں اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا پھر خود ہی سمجھ بھی گئی تھی۔ ہاں یہ اور پھر بھی میرے ساتھ ہی ہونا تھا۔ زندگی کی بہت ساری محرومیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور مستقل محرومی۔ دنیا میں واحد تم نہیں ہو جو اس اذیت سے دوچار ہو تمہیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہیں علاج دوا ہر سہولت میسر ہے۔ اس کی آواز اور اس کا لہجہ دونوں بہت دھیمے تھے۔ مجھے صرف وہ تڑپ کاٹتی ہے جب میری اکھڑی ہوئی سانسوں پر میری ماں کی آنکھ روتی ہے مجھے صرف اپنی ماں کے آنسو رلاتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے وہ بغور اس کی آنکھ سے بہتے آنسو دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی آنکھیں بھابھی کی آنکھوں جیسی لگیں تم سب عورتیں روتے ہوئے ایک جیسی لگتی ہو۔ تم جانتی ہو بھابھی بھی بالکل تمہارے

جیسی ہیں پل میں ہنستی ہیں۔ پل میں روتی ہیں۔

وہ اس کی بات کے جواب میں خاموش رہی۔ جانتی ہوں وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ کیوں اس کی سوالیہ نظریں اٹھیں۔ کیونکہ ان کے اندر بھی ایک ایسی ہی اذیت ہے ایک ایسی ہی محرومی ہے جو انہیں سانپ کی طرح کاٹتی ہے اس کے سپاٹ چہرے پر مریم کی نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ اس نے بہت آہستگی سے پلکیں جھکا لیں۔ اسٹاپ اتنی دور بھی نہیں لیکن چلتے ہوئے تھکن سی ہونے لگتی ہے۔ اس نے بات بدلتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔ تھکنا ہوتو نہیں ہے اس کی بات پر اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اوکے میں چلتا ہوں آج اکمل کی طرف جانا تھا مجھے اسٹاپ پر پہنچتے ہی اس نے کہا اوکے وا سے بہت دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جب وہ گھر پہنچا تھا۔ حسب عادت آتے ہی اس نے پہلے بھائی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ جائے نماز بچھائے بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ اسے قدرا سے اطمینا ہوا۔ بھابھی کو کھانا گرم کرنے کا کہتے ہوئے وہ نہانے گھس گیا۔

اور جب ایک وہ باہر نکلا بھابھی کھانا نکالنے بیٹھی تھی۔ آپ نے کھالیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ہوں۔ کیسی طبعیت ہے بھائی کی اس نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔ اس کے سوال پر بھابھی کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں آج صبح سے ان کی طبعیت خراب ہے کھانسی کی شدت بڑھتی جارہی ہے دوا کھانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہورہا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ پٹل کی اکیڈمی میں فون کردیتی ہوں مگر منع کردیا کہنے لگے۔ اسے پریشان مت کرو پھر میں نے پڑوس سے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ انہیں ساری کیفیت بتائی۔ رات نو بجے آنے کے لیے کہا ہے ڈاکٹر نے بھابھی نے اسے تفصیل سے بتاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ساڑھے آٹھ تو ہوگئے ہیں۔ ابھی نکلیں گے تبھی وقت پر پہنچ پائیں گے۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ آپ بھائی سے کہیے میں ٹیکسی سے لے کر آتا ہوں اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا کلینک سے گھر پہنچے کے بعد اس نے رپوٹس اور دوائیاں بھابھی کو پکڑ دی تھی آج ہی اس اکیڈمی سے تنخواہ ملی تھی۔ ڈھائی ہزار روپے ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں پر خرچ ہوئے تھے اب اس کی جیب میں پانچ سو روپے تھے وہ کمرے سے باہر نکلا تو بھابھی صحن کی لائٹ آف کردی تھی۔

بھابھی یہ اس نے جیب سے پانچ سو روپے نکالتے ہوئے ان کی طرف بڑھاے۔ یہ بھی مجھے دے دوگے تو پھر اپنے پاس کیا رکھو گے۔ انہوں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا آپ کو گھر چلانا ہوتا ہے لیکن مجھ پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے اس نے بات کو ہلکا پلکا رخ دیا تھا۔ مجھے جاب مل جائے گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ڈاکٹر نے تم سے کیا کہا تھا انہوں نے اس کے چہرے پر کچھ کھوجتے ہوئے پوچھا ہاں کہہ رہے تھے نئی اور پرانی رپورٹس میں زیادہ فرق نہیں ہے اس نے انہیں مطمئن کرنا چاہا فرق بہتری کی طرف ہے انہوں نے بہت امید سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا آن ہاں بھائی سوگئے کا ای اس نے بات کو ٹالنا چاہا تھا۔ اس کے اس طرح بات بدلنے پر ان کی آنکھوں کی جوت بجھنے لگی۔ تمہارے چہرے پر جھوٹ اچھا نہیں لگتا پٹل۔ مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا۔ انہوں نے پلٹتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ سچ کہوں گا تو آپ کو دکھ ہوگا۔ جھوٹ بولوں گا تو بدگمانی ایسا کیا کروں کہ آپ خوش رہیں۔ اس نے صحن کی تاریکی میں دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

رزلٹ کے بعد اس نے اپنے علاقے کے ایک اسکول میں جاب حاصل کر لی اسکول اور اکیڈمی کی تنخواہ ملا کر وہ چھ ہزار روپے ماہوار کمانے لگی تھی۔ اور اس پر وہ بہت خوش بھی تھی۔ اب ہر مہینے اپنے اندر چھپی ہوئی لاتعدا خواہشوں میں سے کوئی ایک خواہش وہ پوری کر لیا کرتی تھیں۔ زندگی معمول کے مطابق شروع ہوئی تو جیسے سب کچھ بدلنے لگا تھا۔ جس دن سے وہ نوکری کرنے لگی تھی اماں کو یکا یک وہ بھی آپا جیسی دکھنے لگی تھی۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھتیں تو اپنا آپ مزید بوڑھا لگنے لگتا اب بھی وہ برآمدے میں بیٹھی اسے صحن میں کپڑے دھوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ کتنی بڑی ہو گی۔ ابھی اتنی سی تھی۔ پورے صحن میں دوڑیں لگاتی پھرتی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا کرتی تھی میں کہیں گر نہ جائے چوٹ نہ لگے جائے۔ اب اتنی ذمہ دار ہو گی۔ مجے پتا بھی نہیں چل سکا اور اتنا وقت گزر گیا انکی نظریں صحن سے ہٹ کر کچن کی طرف بھٹک گئی تھی۔ جہاں آپ مگن اندامیں تو اچولہے پر چڑھاے روٹی بیل رہی تھی کتنا ساتھ دیا ہے اس نے میرا۔ میری ہر پریشانی کو بنا کے جان لتی ہے جانے کب سے اس کی گھر کی ڈور سنبھال رکھی ہے اس نے کیا کیا ہے میں نے ان کے لی وہ سر جھکاے اپنا احتساب کر رہی تھی۔

کیا بات ہے اماں۔ آپ اتنا خاموش کیوں بیٹھی ہیں۔ اس نے کپڑے دھونے کے بعد اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوے ان کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔ تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کپڑے مت دھویا کرو سمجھتی کیوں نہیں ہو تم۔ انہوں نے اپنی سوچوں کا رخ بدلتے ہوے کہا تھا۔ کچھ نہیں ہوتا اماں۔ آپ یونہی ہر بات میں ڈرتی رہتی ہیں۔ وہ ان کی گود میں سر رکھتے ہوے بولی تھی اماں میرے سکول میں ایک ٹیچر ہیں خاصی بڑی عمر کی ہیں بہت سوں کی شادیاں کروچکی ہیں۔ ٹیچنگ کے ساتھ ساتھ یہ بھی پروفیشن ہے ان کا ہم ان سے آپا کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ اس نے بہت سوچتے ہوے کہا تھا اماں اس کی بات پر بے ساختہ مسکرا دیں میں نے اپنی فیکٹری میں ایک عورت سے بات کر رکھی ہے وہ کہہ رہی تھی ۔ انشاءاللہ ایک دو دن میں کوئی اچھا سا رشتہ بتاے گئ۔ اب دیکھو آ گے اللہ مالک ہے نزہت کی کر دوں تو پھر تمہاری باری بھی آے اماں نے اس کی پیشانی چومتے ہوے کہا۔ جی نہیں میری کوئی باری واری نہیں ہے اس نے ان کی گود میں منہ چھپاتے ہوے کہا۔ لو تمہاری باری کیون نہیں ہے اماں نے ہنستے ہوے کہا۔ اگر میں بھی چلی جاؤں گی تو پھر آپ کے پاس کون رہے گا بتائیں۔ اس نے اٹھتے ہوے پوچھ تم کہاں جا رہی ہو۔ آپا نے کچن سے نکلتے ہوے جس انداز سے پوچھاااسے سن کر اس کی اور اماں کی بے ساختہ ہنسی نکل گئ۔

آئمہ کی منگنی تھی۔ ماریا اور نور انوائیٹ تھے۔ فنکشن ہوٹل میں تھا اور آئمہ ابھی تک پارلر سے تیار ہو کر نہیں آئی تھی۔ کوئی فرینڈ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاصی حد تک بوریت محسوس کر رہی تھی۔ جب آئمہ کی کزن اس کا پیغام لے کر آئی۔ آئمہ ڈریسنگ روم میں آپ کا انتظار کر رہی ہے آئے۔ اس نے کہا تو ہو شکر ادا کرتے ہوے اس کے ساتھ چل پڑی تھی ڈریسنگ روم میں پہنچتے ہی اس کی پہلی نگاہ سامنے صوفے پر بیٹھے اکمل پر پڑی تم اسے اکمل کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ پورے ایک برس کے بعد ملے ہیں ہم لوگ بہت برے دوست ثابت ہوے۔ تم ایک بار بھی ملنے نہں آ ے۔ جوابا وہ بہت خوش دلی سے مسکرایا۔ کہاں ملنے آتا تمہارے گھر تمہاری اماں کان سے پکڑ کر نکالتیں مجھے۔ اس نے اپنا کان پکڑ کر کہا۔ ہاں یہ تو ہے اس نے ہنستے ہوے اعتراف کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ حرکت اخلاق کے خلاف ہے اچھے مہمان کو چاہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے میزبان سے ملے۔ آئمہ کی آواز پر اس نے یک لخت پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا اور سجی سنوری دلہن بنی آئمہ کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئ

۔کتنی اچھی لگ رہی ہوتم۔اس نے اس سے گلے ملتے ہوے کہا۔

ہیں واقعی یہ اکمل تو سارا راستہ مجھے باتیں سناتا ہوا آیا ہے اتنے برے برے نقشے کھینچ رہا تھا میری شکل کے کہ مجھے لگ رہا تھا مجھے سے بد صورت اس دنیا میں نہیں ہوگا ماریا حیران رہ گئی۔ کیا پالر سے اکمل تمہیں لے کر آیا ہے وہ تو سے کمرے میں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ ان دونوں کے سابقہ رویے کی وجہ سے۔نہ صرف واپس لے کر آیا ہوں بلکہ اپنے ساتھ پارلر کے لے بھی گیا تھا۔اس نے مزید اطلاع پہنچائی یہ صلح صفائی کب ہوئی۔حیرت ہے مجھے خبر نہیں اس نے آئمہ کو گھورتے ہوے کہا۔بس میں نے سوچا لڑکی پیا دیس جا رہی ہے میکے کی اچھی یادیں لے کر جاے وہ مسکرایا۔ بڑا کمینہ ہے میں نے انوٹیشین دینے کے فون کیا تو کہنے لگا بابر علی مان گیا کیا۔اس نے جس انداز میں شکایت لگائی اس پر ماریا کو بے ساختہ ہنسی آ گی۔یار تم نے تھوڑا سا انتظار تو کیا ہوتا ہوسکتا ہے۔قسمت میں بار یابی لکھی ہوتی۔اس کے بات پر آئمہ نے گھور کرا سے دیکھا۔ یوٹو بروٹس۔نور نہیں آیا۔پھر اچانک یاد آنے پر اس نے پوچھا اسے کچھ کام تھا معذرت کرنے کو کہا تھا شاید تمہیں خود فون کرے۔اس کا لہجہ اپنے آپ دھیما ہو گیا۔ہاں اس کے بھائی بیمار ہیں آج چیک اپ کے لیے لے جانا تھا کل بتا رہا تھا وہ۔مجھے بھی وہیں جانا ہے اوکے بیسٹ آف لک آئمہ۔اکمل نے اٹھتے ہوے کہا۔تم ہاسپٹل جارہ ہو۔ماریا نے پوچھا۔ ہوں تم بھی جانا چاہتی ہو۔اس کے سوال پر اس نے بہت آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔اوکے مجھے دیر ہو رہی ہے میں چلتا ہوں۔وہ دونوں کو خدا حافظ کہتے ہوے باہر نکل گیا۔ماریا۔آئمہ کی آواز پر وہ پلٹی ہوں۔نور کا کیا اردارہ ہے اب اس نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔کس بارے میں وہ حقیقتا حیران ہوئی تمہارے بارے میں یہ تو میں نہیں جانتی۔اس نے صاف گوئی سے کہا۔کیوں تم نے پوچھا نہیں ہے اس سے وہ حیرانی سے بولی۔میں کیسے اس سے بات کر سکتی ہوں جبکہ اس کے بھائی بیمار میں حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں اس سے اس موضوع پر بات کر سکوں۔اگر حالات ہمیشہ ہی ایسے رہے تو کیا تم کبھی بھی اس سے یہ بات نہیں کروگی۔اس کی تلخ باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔میری سمجھ میں نہیں آتا جب وہ تم سے اتنی محبت کرتا ہے تو وہ تم سے شادی کیوں نہیں کرلیتا۔تم اس سے کہہ دو کہ تمہں کچھ نہیں چاہے سواے اس کے۔وہ اپنے حالات سے پریشان ہے اور میں اس سے شادی کی بات لے کر بیٹھ جاؤں۔

میں زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس سے یہ بت نہں کروں گی۔جب وہ محوس کرے گا کہ اب وہ سیٹل ہے تو وہ مجھ سے خود ہی بات کرے گا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہا۔میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں ماریا۔کیونکہ تم میری واحد ایک اچھی اور پیاری دوست ہو۔میں تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر بھی اداس نہیں دیکھ سکتی۔وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوے بولی۔میں خوش ہوں آئمہ اور یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں اتنا مہنگا میک اپ کروانے کے بعد کوئی بے وقوف لڑکی ہی روتی ہوگئ۔اس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا اس کے ہاتھ دباتے ہوے کہا جوابا وہ بس مسکرائی تھیں۔

بی اے کی الوداعی پارٹی تھی۔ریفرشمنٹ کے بعد وہ اسے ہر طرف ڈھونڈتے ہوے جونیر سکیشن کی طرف آئی تھی اور اسے وہیں بیٹھا دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تمہیں ہر جگہ ڈھونڈ آئی۔وہ اس کے سامنے چیئر گھسیٹ کر بیٹھتے ہوے بولی۔جوابا اس نے

کوئی تبصرہ نہیں کیا۔میں تمہارے لیےایک گفٹ لائی ہوں اس نے اپنے بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی سی چیز نکالی تھی۔
نور نے بنا کچھ کہے اپنی ہتھیلی پھیلائی تھی اور سیاہ رنگ کے چھوٹے ءسے لائٹر کو دیکھ کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ مجھے معلوم ہےانجام رو داو محبت،مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعی رایئگاں کرلوں۔اس نے تلخی سے کہا تھا وہ اسامنےبیٹھی ہوئی اس کے شکریے پر دہل کر رہ گئی۔ جب تم ایسی باتیں کرتے ہو میرا جی چاہتا ہے میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں اس کی کانپتی ہوئی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔تم مڈل کلاس لڑکیاں غربت کی طرح آنسو بھی تم کو وراثت میں ملتے ہیں وہ پھر تلخ ہوا۔ ہر بات میں دولت ہر بات میں طبقہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔اس نے روہانسے انداز میں کہا کیا ہر قدم پر ہمیں دولت کی ضرورت نہیں پڑتی۔کیا ہر مقام پر ہمیں طبقے کا سامنا نہں ہوتا۔اس کی بات کا وہ کوئی جواب نہں دے پائی۔کیا تم ابھی تک اپنی جاب سے مطمئن نہیں ہو ایک برس بہت ہوتا ہے کسی جگہ پر اڈجسٹ ہونے میں اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی۔وہ اس کی بات کاٹ کر بولا جو میں نے چاہا تھا۔وہ نہیں ہوا اور جو میں نے نہیں چاہا تھا وہ ہو رہا ہے اور مسلسل ہو رہا ہےایک اسکول کی نوکری سے کتنا مطمئن ہو سکتا ہوں میں۔چند ہزار کما کر کیا کیا بنا سکتا ہوں میں۔
اس کی آواز اونچی ہونے لگی۔ جب یہ چند ہزار بھی نہیں تھے تب بھی تو جی رہے تھےتم تم لاکھوں نہیں کما رہےتو اس کے بغیر بھی بہت کچھ حاصل ہےایک ایم اے اردو کواجتنی اچھی جاب مل سکتی ہے وہ تمہیں مل چکی ہے ءاس کی بات پر وہ بہت خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا اب تم مجھے قناعت کی تلقین کروگی۔صبر پڑے جائے تو پھر صبر کرنا پڑتا ہےضبط آزمایا جائےتو ضبط کرنا پڑتا ہے یہ بات میرے سمجھانے کی نہیں ہےاس نے بہت سپاٹ انداز میں کہا۔تم کیا سمجھتی ہو۔مجھ میں صبر کا حوصلہ نہیں ہےغلط سمجھتی ہو تم میری جھونپڑی میں اگر آگ لگے گی۔تو میں محلوں کو پتھر نہیں ماروں گا۔اس نے سی کے لاءہوئے لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا تھا۔ہمیں ہر طرح کے حالات سے سمجھوتا کرلینا چاہیےنور۔
اس نے صلح جو انداز میں کہا تھا جس پر وہ کچھ لمحے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔آئمہ کی منگنی میں تم نہیں گئے۔وہاں کتنے بہانے بنانے پڑے مجھے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ تم تین چار دن سے مجھ سے ملے ہی نہیں تھے اکمل نے میرے بہانے کا بھرم رکھا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔آنکھ میں اگر آنسو ہوں تو انہیں بہا دیا کرو۔وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔اس نے کچھ بھی کہےبغیر آنکھ میں آئے آنسو کو انگلی کو پوروں سے صاف کیا میرے سامنے بیٹھ کر سگریٹ مت پیا کرو۔باوجود ضبط کے اس کی آواز ابھی تک بھاری تھی۔حیرت ہے منع بھی کرتی ہو اور۔وہ اس کے دیے ہوئے لائٹر کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ظاہر ہے جب ایک بندے پر کسی کی بات کا اثر نہ ہوتا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔اس نے جوابا کہا۔تمہارا کیا خیال ہے میں کس حد تک دوسروں کی باتوں سے اثر لے سکتا ہوں۔اس نے کش لگاتے ہوئے پوچھا۔ایک فیصد بھی نہیں اس نے صاف گوئی سے کہا۔اتنی مایوسی بھی اچھی نہیں وہ مسکرایا۔تم نے سوال پوچھا تھا میں نے جواب دیے دیا۔اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ایک سوال اور پوچھوں۔اس نے جلتے ہوئے سگریٹ کو پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا۔
ہوں۔کیا تمہیں یقین ہے ک جو تم چاہتی ہو۔وہ ہو جائے گا۔اس کے سوال پر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی کیا تم جانتے ہو کہ میری چاہت کیا ہے اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔شاید۔نہیں اگر تم جانتے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔سوال کرنے کا حوصلہ ہے تو جوا

ب سننے کا حوصلہ بھی رکھو۔ وہ تلخ ہونے لگی ضروری نہیں ہوتا ہم جسے چاہیں اسے پا بھی لیں کبھی کبھی ہم جو چاہتے ہیں ہمیں نہیں بھی ملتا۔ اس کی بات پر وہ ایک بار پھر حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کیا ہوا ہے نور کیوں کر رہے ہو ایسی باتیں وہ چیز جو تمہیں نہیں مل پا رہی اس میں میرا قصور نہیں ہے اس کی بات پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ تمہیں مجھے سے محبت ہے، بہت عجیب سوال تھا وہ جی بھر کے حیران ہوئی تم کیا سمجھتے ہو میں جو پچھلے تین سال سے تمہارے ساتھ ہوں تو کس لیے۔ اس نے سوال پوچھا تھا تو جواب دینا بھی لازمی تھا۔ اس میں تمہاری اپنی غرض بھی ہو سکتی ہے۔

تم جو یہاں جاب کرتی ہو تو اس میں تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ پورے شہرے میں یہ واحد اکیڈمی نہیں ہے نور ہمارے ہر عمل کے پیچھے ہماری غرض چھپی ہوتی ہے وہ غرض محبت بھی ہو سکتی ہے اس کی بات پر خاموش رہی اب تم اپنی بات پر جتنا بھی خوب صورت ریپر لپیٹ دو۔ اس بات کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ جو تم کہہ چکے ہو۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ مداوا کسی دکھ کا نہیں ہوتا۔ لیکن دکھ دینے والے کو اس کا احساس تو ہونا چاہیے۔ وہ اس کی بات پر تیزی سے بولی تھی کسی کو کسی کے دکھ کا احساس نہیں ہوتا یہ بات آج تم جان لو۔ اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا تھا میں شاید کبھی بھی تمہیں سمجھ نہیں سکوں گی نور اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا

اس کے کہے لفظوں پر وہ کئی لمحے تک خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی ۔

اماں کی جاننے والی کے توسط سے جس طرح اچانک رشتہ طے ہوا تھا اسی تیزی سے بیاہ بھی ہو گیا تھا سب کچھ اتنا آنا فانا ہوا تھا کہ کسی خواب کا گمان ہوتا تھا آپا کے شوہر کی اپنی اسٹشنری کی دوکان تھی اور گھر بھی اپنا تھا بہت خوش تھیں۔ جس ذاتی گھر کے خواب وہ دیکھتی رہی تھیں وہ دیکھتی رہی تھیں۔ وہ خواب ان کی بیٹی کی تعبیر بن گیا تھا وہ خوش کیوں نہ ہوتیں! آپا کے جانے کے بعد گھر میں ایک سناٹا سا رہنے لگا تھا شام میں وہ گھر آتی تو وہ اماں کو چپ چاپ صحن میں اکیلے بیٹھا دیکھ کر اسے بے ساختہ ان پر پیار آنے لگتا۔ اماں آپ یوں خاموش کیوں بیٹھی رہتی ہیں۔ تو دیواروں سے باتیں کروں کیا۔ وہ اس سے خفا نظر آ رہی تھی۔ اماں آپ مجھے سے ناراض ہیں مگر اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اچھا اب تو میں آ گئی ہوں نا اب ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے ایسا کرتے ہیں کہ کل ہم آپا کے گھر جائیں گے ٹھیک۔ اس نے انہیں مناتے ہوئے کہا۔

ہاں جب وہ گھر آتی ہے تب تو تم اس کی کوئی بات مانتی نہیں ہو۔ اس کے گھر جا کر کیا کرو گی۔ اماں اس نے شکایت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ہاں تو کیا غلط کہتی ہے وہ۔ وہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولیں آپا کو تو شادی کے بعد یہی ایک موضوع ہاتھ آ گیا ہے ہم کسی اور ٹاپک پر بات نہیں کر سکتے۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ نہیں انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ اماں ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کیوں نہیں سمجھتی ہیں یہی تو سمجھنا چاہتی ہوں میں۔ انہوں ے جس گہرے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اس پر اس کی آنکھیں اپنے آپ جھکتی چلی گئی تھی۔ ماریا انہوں نے آہستگی سے پکارا جی! دل میں چور تھا کہ آنکھیں اٹھائی نہیں جاتی تھیں۔ تم نے کالج میں پڑھا یونیورسیٹی میں پڑھتی رہیں۔ پھر نوکری کرنے لگیں جو تمہارا دل چاہا۔ تم نے کیا میں نے نہیں روکا۔ تم نوکری کرنے لگیں تمہاری مجبوری تھی۔ جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ہم ایک نئی دنیا دیکھتے ہیں ہمیں بہت سے لوگ ملتے ہیں کسی کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ کس کا چہرہ اچھا لگتا ہے صحیح کہہ رہی ہوں نا میں۔ اماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جو اس کو سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ وہ ایک ماں کھل کر تو پوچھ نہیں سکتی

اور جوانہوں نے پوچھا تھا وہ انہیں بتا نہیں سکتی تھی۔گھر سے باہر کی دنیا کو ہم گھر کے اندر تو نہیں لا سکتے وہ دنیا ہمیں لا کھ اچھی لگے۔

ہم اتنے بااختیار نہیں اس کے اندر کوئی چیخا تھا۔ مجھے باہر کی دینا اچھی نہیں لگتی ہے وہ بہت آہستگی سے کہتے ہوے اندر کی طرف بڑھ گی نور صبح کہتا ہے غربت ایک ایسا نوکیلا جال ہے جو انسان کو اپنے اندر جکڑ کر لہولہان کر دیتا ہے یہ غربت ہی تو ہے جس کی وجہ سے اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ہم دونوں اپنے گھر میں ایک دوسرے کا ذکر تک نہیں کر پائے۔ یہ غربت ہی تو ہے جو دل کی بات کو زبان تک آنے سے روکتی ہے اسے حالات جازت نہیں دیتے اور مجھے لحاظ جب تک حالات بدل نہیں جاتے۔میری زبان کوئی لفظ نہیں بولے گی۔ جب وہ اس مقام تک آ جائے گی جو وہ پانا چاہتا ہے تو وہ خود میری طرف بڑھے گا۔ابھی وہ ٹینس ہے اور میں اسے کبھی بھی پریشان نہین کروں گی۔چاہے جتنا بھی وقت لگے میں اسکا انتظار کروں گی یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔اس نے اپنے دل میں عہد کیا۔

آج اٹھواں روز تھا انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروائے بیماری اب اس اسٹیج پر تھی کہ گھر میں وہ دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تھی جو یہاں میسر تھی۔دن کا سارا وقت بھابھی ہاسپٹل میں ان کے پاس رہتی تھیں اور رات کو وہ ان کے پاس رہتا تھا۔اس وقت بھی وہ اکیڈمی سے سیدھا وہیں آیا تھا۔ جس وقت وہ کمرے میں پہنچا۔ بھائی سو رہے تھے اور بھابھی انکے سامنے والے بینچ پر بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔کیسی طبیعت ہے اس نے روازنہ کا سوال دہرایا تھا۔انہوں نے خاموشی سے اس کے ہاتھوں سے دوائیاں پکڑی تھی۔اور بیڈ کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی تھیں کس وقت سوے تھے بھائی۔اس نے بستر پر پڑے ان کے کمزور وجود کو دیکھتے ہوے پوچھا تھا کچھ ہی دیر ہوئی۔انہوں نے قرآن پاک کو جز دان میں لپٹتے ہوے جواب دیا۔ہوں چائے ءلاؤں آپ کے لیے۔چاہے تھرماس میں تم پیو گے۔ان کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔دل نہیں چارہ رہا۔

آپ ابھی بیٹھیں گئی یا میں گھر چھوڑ کر آؤں آپ کو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور یوں بھی دو افراد کے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں چاہ رہی تھی۔یہ اٹھ جاتے تو تب میں جاتی لیکن نیند انجکشن کی وجہ سے بہت گہری ہے۔جانے کب اٹھیں۔وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرر ہی تھی۔اماں !پریشانی آزمائشوں کا حل نہیں ہوتی اس بات پر انہوں نے گہرا سانس لیا۔جانے اور کتنی آزمائش لکھی ہے بے شک اللہ آزمائشوں سے نکالنے والا ہے انہوں نے اپنی ہتھیلوں کو دیکھتے ہوے کہا تھا۔آپ نے تو کبھی ہمت نہیں ہاری۔اماں آپ تو بہت بہادر ہیں یہ تو وقتی آزمائش ہے پھر سب پھر سب ان کی آنکھوں میں آس کے دیے جلنے لگے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔اسے دو جلتے ہو دیے بہت اچھے لگے تھے۔ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔اللہ کبھی کسی پر اس کے ظرف سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔ان کے لہجے میں سکون اتر آیا۔ہمیں اپنے ظرف کا اندازہ نہیں ہوتا دکھ ملتے ہیں تو ظرف بھی بڑھنے لگتا ہے۔اس نے سوچا مگر کہا نہیں بھائی اٹھ گے تھے بھابھی انکی طرف متوجہ ہو گئیں۔تم کب آے۔انہوں نے پوچھا۔آواز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ابھی آیا ہوں۔وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے ہاتھ اپنے ءہاتھوں میں لیتے ہوے بولا۔ابھی آیا ہوں۔وہ ان کے قریب بیٹھ کر انکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لتے ہوے بولا۔ بہت کمزور ہو گے ہو تم اپنا خیال رکھ کرو،ان کی بہت مدھم آواز پر اس کا دل پگھلنے لگا۔نہیں تو بھائی میں تو بالکل ہٹا کٹا ہوں اس نے مسکراتے ہوے کہا تھا۔تم خیال نہیں رکھتی ہو پنل کا انہوں ے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔وہ بھابھی سے شکایت کرنے لگی تھی۔صبح اسکول،شام کو اکیڈمی رات کو آپ کے پاس دن رات کی محنت چوبیس

گھٹنے کی فکر، کمزوری تو ہوگئی ہی۔ آپ ٹھیک ہوکر گھر آجائیں تو ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔ بھابھی کی آواز بھاری ہونے لگی۔

ان کے پکارنے پر اس نے چونک کر انکی طرف دیکھا تھا۔ جی۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں کب چھٹی ملے گی مجے اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ابھی کچھ دن اور رہنا پڑے گا بس رپورٹس آجائیں تو میں خود بات کروں گا ڈاکٹر سے اس نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوے کہا۔ مجھے گھر جانا ہے مجھے گھر لے چلو۔ میں ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ میں یہ بات جانتا ہوں یہ ہاسپٹل یہ دوائیاں میری زندگی بڑھا نہیں سکتے۔ جو میری چند سانسیں بچی ہیں وہ مجھے میرے گھر میں گزرانے دو۔ انہوں نے ہاتھ جوڑے تھے اور وہ تڑپ اٹھا۔ ایسے کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا مت کریں۔ ہم گھر چلے جائیں گے گھر ہی جانا ہے ہمیں۔ وہ ان کے جڑے ہوے ہاتھوں کو کھولتے ہوے بولا دنیا کا کوئی دکھ اتنا نہیں رلاتا جتنا بے بسی ان کی بات پر بھابھی کے آنسو چھلکے جہین چھپانے کے لیے وہ رخ موڑ کر کھڑی تھیں آپا صبح سے آئی ہوئی تھی اور وہ ان کی آمد کا مقصد جانتی تھی تبھی ان سے چھپتی پھر رہی تھی جہاں وہ جاتیں وہ غیر محسوس طریقے سے وہاں ہٹ جاتی۔ وہ اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ فوذات سے کھیلتی تر ہی جب وہ سو گیا تو آپا۔ اس کے کمرے میں آئیں۔ کیا سوچا ہے تم نے۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔ کس بارمیں۔ وہ سکسر انجان بن گئی۔ اپنی شادی کے بارے میں انہوں نے بہت سکون سے جواب دیا۔ میں اس بارے میں کوئی بات کرنے نہیں چاہتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔ تم کے سزا دے رہی ہو مجھے اماں کو خود کو چار سال ہوگے ہیں تمہیں نوکری کرتے ہوے اور چار سال ہوگے ہیں تمہیں مسلسل شادی سے انکار کرتے ہوے۔ کیوں تم سمجھتی ہو کہ ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ اس کیوں کا مطلب نہیں سمجھ سکتے تم مسلسل شادی سے انکار کرو اور ہم تمہیں بچہ سمجھ کر ٹالتے رہیں۔ غلط سمجھتے ہیں آپ لوگ اس نے ترخ کر کہا۔ تو پھر صحیح کیا ہے تم ہمیں بتا دو۔ ہم وہ کہہ لیں گے۔ انہوں ے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کچھ نہیں ہے اگر کوئی بات ہوئی تو اب تک آپ کے سامنے آچکی ہوتی اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

ٹھیک ہے اماں نے تمہارے لیے ایک رشتہ دیکھا ہے لڑکے کی اپنی دکان ہے مجھے کسی دکاندار سے شادی نہیں کرنی۔ اس نے ان کی بات کاٹتے ہوے کہا پھر کس سے شادی کرنا ہے کسی سے نہیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوے کہا۔ ماریا۔ تم ٹھندے دل سے مری ی بات پر گور کرو ہم تمارا بھلا چاہتے ہیں۔ تم اب عمر کے جس دور میں وہاں رشتوں کی لائن نہیں لگے گی۔ ستائیس سال کی عمر ایک لڑکی کی شادی کے لیے بہت زیادہ ہوتی ہے تمہیں میری بات تلخ لگے گی مگر یہ بات سچ ہے وہ رشتے جو آج آرہے ہیں چند سال گزرے کے بعد ان میں سے کوئی ایک رشتہ بھی نہیں آے گا تو پھر تم کیا کروگی۔ کیا تم ساری عمر یونہی گزرا دوگی۔ تم میری بات مانو جو اماں میں سے کوئی ایک رشتہ بھی نہیں آے گا تو پھر تم کیا کروگی۔ کیا تم رشتے جو آج آرہے ہیں چند سال گزرنے ک بعد ان میں سے کوئی ایک رشتہ بھی نہیں آے گا تو پھر تم کیا کروگی۔ کیا تم ساری عمر یونہی گزردوگی۔ تم میری بات مانو جو اماں چاہتی ہے اسے پورا کردو یہ رشتہ ہر لحاظ سے تمہارے لیے بہتر ہے ہم نے ان سے کچھ نہیں چھپایا اماں نے ان کو یہ بتادیا ہے کہ ہم کہ میں۔ اس نے ان کی بات کاٹتے ہوے کہا۔ آپ نے ان لوگوں کو سچ بتادیا۔ بہت نوازش ہے آپ کی آپ نے مجھے پر احسان کیا۔ بہت احسان ہے ان لوگوں کا بھی مجھ پر جنھوں نے ایک بیمار لڑکی کو قبول کرلیا۔

لیکن مجھ سے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ میں یہ احسان لینا بھی چاہتی تھی یا نہیں ،۔اب بھی تم کہتی ہو کہ تمارے اندر کوئی نہیں ابھی بھی تم کہتی ہو کہ تمہارے اندر کوئی نہیں ابھی بھی تم اس بات سے انکار کرتی ہو کہ کوئی دوسرا وجود نہیں ہے یہ زہر تم نے تو تمہارے اندر نہیں بھرا ماریا۔ وہ اذیت جو تمہارے لفظوں سے جھلک رہی ہے۔وہ اذیت تمہیں اس گھر میں کبھی نہیں ملی۔ہم دونوں نے دوستوں کی طرح اکٹھے وقت گزارا ہے جو بیگانگی آج تمہاری لہجے میں ہے وہ اس سے پہلے نہیں تھی تم جو چاہتی ہو ہو کہو تو ہمیں تمہاری خوشی عزیز ہے کیونکہ ہم یہ سب تمہاری خوشیوں کے لیے ہی کرنا چاہتے ہیں آپا نے اس کے قریب آتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔میری خوشی اس میں ہے کہ آپ مجھے سے اس موضوع پر بات نہ کیا کریں۔اس نے پلٹے بغیر کہا تھا اور اسی رخ سے باہر نکل گئی۔

صبح چھ بجے سے وہ آئی سی یو میں تھے۔حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ مسلسل تین دن سے تیز بخار کی وجہ سے نیم بے ہوشی تھی۔تلخ حقیقت تو پوری آنکھیں کھولے اسکے سامنے تھی پھر بھی دل کو آس ایک روشن امید تھی لیکن وہ امید روشن نہیں ہو پائی۔ڈاکٹر نے باہر آکر اس سے کچھ کہا تھا بھابھی کی گھٹی گھٹی سسکیاں ای دردناک چیخ میں بدلی تھیں وہ کچھ بھی سن نہیں پا رہا تھا۔اس کے کانوں میں صرف ایک آواز تھی۔میں جانتا ہوں میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔لیکن میں تمہارے ساتھ ابھی کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔یہ آخری بات انہوں نے پرسوں رات اس سے کہی تھی۔اس کی آنکھیں ابھی تک گلاس وال سے پرے دیکھ رہی تھی۔

وہ کئی روز سے اکیڈمی نہیں آ رہا تھا۔وہ روز نہ آتے ہی اس کا انتظار شروع کرتی تو جاتے وقت تک اسے اس کے آنے کی آس رہتی تھی اور آج تو پندرہ روز ہو گے تھے۔اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔تب ہی ہاف لیو لینے کے بعد وہ آ جس سبزہ زار پہنچ گئی تھی۔اسٹاپ پر اترنے کے بعد تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس کا گھر ڈھونڈنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی ابھ چند روز پہلے تو وہاں آئی تھی۔اور اب اس کے گھر کے بوسیدہ سے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے کئی مرتبہ سوچا۔کیا مجھے یہاں آنا چاہے تھا۔کیا میں غلط کر رہی ہوں لیکن اس میں غلط کیا ہے میں اس سے صرف یہی پوچھنے تو آئی ہوں کہ وہ اتے روز سے اکیڈمی کیوں نہیں آ رہا۔میں تھوڑی دیر بیٹھوں گئی اور پھر چلی جاؤں گی۔اس نے دل میں ہزار وجواز سوچتے ہوئے درواے پر دستک دی تھی ایک بار دوبار تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا تھا اور دروازے پر نور کی بھابھی کو دیکھ کر اس نے بے اختیار انہیں سلام کیا تھا۔

وعلیکم السلام ان کی آنکھوں میں اپنے لیے اجنبیت دیکھ کر سوچ رہی تھی۔کیا کہوں میں کون ہوں اور کیوں آئی ہوں۔میں میرا نام ماریا ہے نور کی کولیگ ہوں میں ۔اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس کی زبان پر الفاظ اٹک رہے تھے۔نور کی کولیگ۔اپنے اس غیر یت بھر تعارف پر اس کے اندر آنسوؤں کا غبار بھرنے لگا۔ آؤ۔بھابھی نے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ان کے پیچھے چلتے ہوئے صحن کے وسط میں پہنچی جب انہوں نے اسے صحن میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا وہ بہت تھک گئی تھی۔اس لیے ان کے لیے کہتے ہی وہ اس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔اکیڈم یہاں سے دور ہے پیاس تو لگی ہوگی۔وہ پانی کا گلاس لے آئی تھی۔شکریہ اس نے بہت ممنونیت سے بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی اس عورت کی طرف دیکھا۔اس شدید گرمی میں پیاس سے خشک ہوتے حلق میں ٹھنڈا جپانی اسے جنت کے مشروب کی طرح لگا اس نے خالی گلاس ان کی

طرف بڑھایا تو وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔ پیاس اور خواہش اگر پوری ہو جائے تو اس سے بڑی خوش قسمتی اور کوئی نہیں ہوتی۔انہوں نے گلاس ایک طرف رکھ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ جی! وہ سر جھکا فقط اتنا کہہ پائی۔ آپ کے شوہر کی ڈیتھ کا بہت صدمہ ہوا وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گی ۔سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے کئی لمحے بہت خاموشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھی تسلی کا ایک لفظ تک کہہ نہیں پائی تھی۔ کیا کہہ سکتی تھی وہ جبکہ وہ ان کے لیے بالکل غیر تھی کئی لمحے بہت خاموشی سے سرک گے تھے۔ جب اسے اپنے پیچھے دروازکھولنے ارپھر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔

وہ قدم نور کے تھے،۔وہ اس کے اٹھتے ہوئے ایک قدم سے واقف تھی پنل تمہاری کولیگ آئی ہیں۔ بھابھی نے اسے کہا۔قدموں کی چاپ رک گئی۔ وہ سامنے آیا تھا اور سامنے اسے بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی انکھوں میں حیرت اتری۔ ماریا نے صرف ایک نظر سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سر کو پھر جھکا لیا۔میں چائے بناتی ہوں بھابھی نے اٹھتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔کب آئی تم،اس نے اس کے مقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔کچھ ہی دیر ہوئی اس نے نظر آٹھائی نہیں جا رہی تھی۔ کیسے پہنچی ہو۔بس آئی ہو۔اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔ہوں۔راستہ معلوم تھا وہ اس سے یوں سوال پوچھ رہا تھا وہ سکول میں پڑھنے والی کوئی بچی ہو۔ہاں میں پہلے بھی آئی تھی۔ چھ بجے کے بعد یہاں سے تمہارے روٹ کی کوئی بس نہیں ملتی اور چھ بجے گے ہیں۔اور وہ یہ سوچتے ہوئے آئی تھی کہ وہ اسے روکے گا اور وہ نہیں رکے گی۔ وہ اسے خود گھر چھوڑ رک آنے کی ضد کرے گا لیکن وہ نہیں مانے گی لیکن وہ کیا کہہ رہا تھا اس نے چونک کر سر اٹھایا شام ڈھل گی تو تمہارے لے مشکل ہو گی۔ وہاس کی آنکھوں میں اس کے ءلہجے میں شرمندگی کا کوئی اثر ڈھونڈ رہی تھی لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔میں تم سے ملنے آئی تھی نور اس نے اپنی انا کی دیواروں کو گرتے دیکھا۔ کیوں۔س کے اس قدر غیریت بھرے سوال پر اسکا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جاے۔

اس کیوں کے جواب می اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن وہ کہہ نہی پائی۔تم اتنے روز سے اکیڈمی نہیں آ رہے تھے۔ مجھے لگا شاید تم بیمار ہو گے۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس سے لفظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔نہیں میں بیمار نہیں تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا صاف ظاہر تھا اب تم جاؤ۔ وہ بھی کھڑی ہو گی بھابھی چاے بنا رہی ہے وہ اسے اٹھتے دیکھ کر بولا نہیں دیر ہو جاے گی۔ وہ اسے اس کی چند لمحے پہلے کہی بات تک جتا نہیں سکی۔ جواب میں اسنے اسے روکا بھی نہیں۔تم کب آؤ گے۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہوے اس نے پوچھا۔ پتا نہیں اس کے جواب پر وہ حیران ہوئی۔ کیا تم اکیڈمی چھوڑنا چاہتے ہوے اس کے سوال پر وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہا تھا شاید مجے ایک جگہ سے جاب آفر ہو ہی ہے۔اس نے بہت مختصر بتایا تھا۔لیکن میں چند روز میں آؤں گا۔اس نے گھڑی دیکھتے ہوے کہا میں چلی جاؤں گی نور۔اگر میں اپنے روٹ کی بس نہیں بھی ملی۔ میں تب بھی چلی جاؤں گی اس کے گھڑی دیکھنے پر اسے توتو ہی کا احساس ہوا تھا۔آؤ میں تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آؤں وہ بات پر شرمندہ ہوے بغیر بولا۔نہیں میں چلی جاؤں گی۔

اس نے بہت مدھم آواز میں کہا تھا۔جیسے تم چاہو۔ وہ اس کی چاہت پر بات چھوڑ رہا تھا اور اس کی پلکیں گیلی ہونے لگی تھیں وہ بہت آہستگی

سے دوروزاے سے باہر نکل گئی۔

سارے گھر میں وحشت ناک خاموشی چھائی تھی صحن کی دیواروں پر ایسی ویرانی تھی جیسے برسوں سے بند پڑا خالی مکان وہ تین نفوس ساکت وصاحت اپنی جگہ کھڑے تھے پھر ان میں سے ایک نفوس میں حرکت ہوئی تھی ۔انہوں نے ایک نظر اپنے ساتھ کھڑی اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور دوسری نظر اپنے پیروں کے پاس پڑے بند بیگ کی طرف پھر وہ بہت آہستگی سے چلتے ہوے اس کے پاس آ کررک گئیں میں جارہی ہوں پنل اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس بات کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا۔تم مجھے ماں کہتے تھے۔کیا آج نہیں کہو گے۔ان کی آوازلرزنے لگی تھی۔ ماں اپنی اولاد کو چھوڑ کر نہیں جاتی اس نے شکایت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا میں تمیں اپنی اولا د سمجھتی ہوں نور دنیا تمہیں میری اولا د نہیں سمجھتی میں دنیا کو کیسے سمجھاؤں ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں میں پالا ہے بہت محبت کرتے تھے تم مجھ سے ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہتے جب کبھی تمہیں کوئی شعر یاد ہوتا۔تم دوڑتے ہوے مجھے آ کر سناتے تھے تم مجھ سے بیت بازی کی ضد کرتے جسے کبھی کوئی شعر کا مصرع تک یاد نہیں رہتا تھا ایک دفعہ تم مجھے اقبال کی غزل سنا رہے تھے تو ایقان نے کہا تھا۔

دیکھنا یہ ادب میں ماسٹرز کرے گا۔کتنا صیح کہا تھا ایقان نے تمہیں خود اسکول چھوڑنے جاتی تھی اور چھٹی سے پہلے ہی میں تمہارے اسکول جا کر بیٹھ جایا کرتی تھی اماں نے ایک بار ہنس کر کہا تھا یہ تو مجھے تمہاری ہی اولا د لگت اہے میں سارا دن گھر کے کام کرتے تمہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی تمہارے سکول کا سارا ہوم ورک میں یہ سو کر کرتی تھی کہ تم تھک نہ جاؤ تم بہت کمزور تھے اور دودھ بھی نہیں پیتے تھے۔سارا دن میرا دوپٹہ پکڑے میرے پیچھے پیچھے رہتے تھے تم ایک دنیا نے دیکھا ہے میں تمہیں اپنی اولا د کی طرح پیار دیا ہے۔اور اب دنیا کہتی ہے کہ تم میری اولا د نہیں ہوان کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر ان کی چادر میں جذب ہو گے تھے۔میں تو آپ کو ماں کہتا ہوں میں تو آپ کو ماں سمجھتا وہ۔آپ نے سوچا ہے آپ چلی جائیں گی تو میں کیا کروں گا کیسے رہوں گا میں کون ہے میرا اس کی آنکھیں ضبط سے سرخ ہو گئی تھی۔ہم دونوں کو خالی ہاتھ رہنا ہے پنل مجھے دیکھو میں س گھر میں خالی ہاتھ ائی تھی اور خالی ہاتھ واپس جارہی ہوں میری بے سروسامانی کا انداز کون کرے ایک عمر بیت جانے پر بھی جس عورت کی گود اور ہاتھ خالی ہوں اس عورت سے بڑا بد قسمت کوئی نہیں ہوتا۔ان کی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھی۔اس نے چادر کے کونے سے ااپنے آنسو پونچھے تھے۔زندگی سے ہارنا نہیں !ایقان تمہیں ایک کامیاب انسا دیکھنا چاہتے تھے اور میں بھی جس انسان کے اپنے اس کے پاس نہ ہوں وہ انسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا ماں اس نے کہا اور بھابھی اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔میں اپنی خوشی سے نہیں جارہی ہوں پنل مجھے دکھ بہت ہے وہ مسلسل رو رہی تھیں۔

میں نہیں رہ سکتا آپ کے بغیر بھابھی میں نہیں رہ سکتا۔باوجود ضبط کے اس کی آنکھو سے آنسو ٹپکتے تھے۔وہ صحن کے وسط میں کھڑی کئی لمحوں تک یاس وحسرت سے گھر کا کونہ کونہ دیکھتی رہیں۔پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوے وہ اس گھر کی دہلیز پار کر گئی ں اور پیچھے وہ اس ویران گھر میں کسی زندہ لاش کی طرح کھڑا تھا ایک پل میں اسے وہ گھر قبرستان لگنے لگا ان ہی قبروں میں سے کچھ آوازیں ابھریں پنل ناشتہ کیے بغیر کالج مت جانا اور یہ جوتے پھر دروازے میں رکھ دیے تم نے آخر کب سدھرو گے۔گھر دیر سے مت آیا کرو۔میرا دل ہو لنے لگتا ہے۔میں تمہارے لیے

بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر پایا۔میں تمہیں بہت کچھ دینا چاہتا تھا مگر نہیں دے پایا تم مجھے معاف کر دینا پنل اس ویران گھر میں سرگوشیاں ابھرنے لگی تھی وہ ایک ایک سرگوشی کو سمیٹتے ہوئے بھائی بھابھی کے کمرے کی طرف آیا تھا وہاں ک ویرانی سے اسے مزید وحشت ہونے لگی تھی۔ پھران آوازوں میں کسی کے اکھڑے ہوئے سانسوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔میں تم سے محبت کرتی ہوں نور نہیں!اس نے چلاتے ہوئے پاس پڑا گلدان اٹھا کر دیوار پر لگے آئینے پر مارا تھا۔نفرت ہے مجھے محبت سے میں اپنی زندگی سے محبت کا لفظ کاٹ دوں گا زوردار چھناکے میں وہ کمزور آواز دب گئی تھی۔

اسے اکیڈمی اسے آئے ابی کچھ ہی دیر گزری تھی۔ جب نور کا فون یا وہ اسے کسی ہوٹل میں بلا رہا تھا تم پندرمنٹ میں یہاں پہنچو میں انتظار کر رہا ہوں فقط اتنی سی بات کہنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔عجیب آدمی ہے گھر جاؤ تو سیدھے نہ منہ بات نہیں کرتا اوراب ہوٹل میں ملاقات کرنا چاہتا ہے میں کیسے سمجھوں تمہیں نور! پتا نہیں کیا کہنا چاہتا ہے وہ مجھ سے شاید مزید انتظار وہ جو بھی کہے گا۔میں مان لوں گی مجھے اس کے حالات کو سمجھنا چاہے جس کنڈیشن سے وہ آج کل گزر رہا ہے سارا راستہ وہ یہی باتیں سوچتے ہوئے آئی تھی۔رکشے والے نے جس ہوٹل کے سامنے اسے اتارا تھا اس فائیو اسٹار ہوٹل کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی تھی۔کیا کہنا چاہتا ہے وہ مجھ سے کیا کوئی بہت خوب صورت با ت گر آج وہ میرا ساتھ مانگنا چاہے گا تو میں ہاں کہہ دوں گی۔کیونکہ میں بھی یہی چاہتی ہوں اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے کپڑوں کو بہت تنقیدی نگاہوں سے دیکھا کس قدر فضول حلیے میں ہون میں آض اچھے کپڑے پہن کر بھی تو آ سکتی تھی۔اسے خود پر غصہ آنے لگا پھر ہاتھوں سے بال سنوارتے ہوئے اس نے اپنی گردن سے لپٹی چادر کو مزید بہتر طریقے سے اوڑھا اور گلاس ڈور کھولتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ جہاں سے اے سی کی خوشکوار ٹھنڈک نے اس کا استقبال کیا تھا اندر داخل ہوتے ہی کونے والی ٹیبل پر نو اسموکنگ کے خوب صورت سے بورڈ کے نیچے وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا اسے نظر آیا تو اوہ اس طرف بڑھ گئی۔تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے تم اکیڈمی بھی تو آ سکتے تھے۔اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی وہ بولی مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔

جو اکیڈمی میں نہیں ہوسکتی تھی۔اس کی بات پر ماریا کا دل خوب صورت لے میں دھڑکنے لگا۔اس کی جھکی ہوئی پلکیں سامنے رکھی ایش ٹرے میں پڑے جلے ہوئے سگریٹوں کے ڈھیر پر جمی تھیں جانے کب سے وہاں بیٹھا تھا۔میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں ایک جلا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں آ کر گرا۔کیا اس نے نے ایک ایسی بات کہی تھی۔جو اس کے گمان میں دور دور تک نہیں تھی۔میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں اسنے اپنی بات دہرائی لیکن کیون۔اسے اپنی آواز میں واضح لرزش محسوس ہوئی تھی۔یہاں کس لے رہوں گا میں کون ہے میرا یہاں اور کیوں رہوں میں یہاں اب کس بچھڑ جانے کا انتظار کروں آج یا کل جب بھی میرے پاس وسائل ہوئے میں یہ ملک چھوڑ دوں گا۔اس باتوں پر ماریا کا دل لرزنے لگا یہاں کس کے لی رہوں گا میں کون ہے میرا یہاں کیا ان سب باتوں کے بعد بھی وہ سے اپنے ہونے کا یقین دلاتی اور کیا وہ یقین کرلتیا اور میں میرے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے میں کیا کروں گی اس کے اندر کوئی چیخا تھا۔تمہیں اپنی باتوں پر ملا نہیں ہوتا۔اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے۔ تو اور کیا ہوں میں۔اس کا لہجہ سرد ہونے لگا۔تمہارے پاس بہت کچھ ہے کوئی آ یک آس ابھی بھی اس کی مٹھیوں میں تھی جو کچھ ہے وہ نا کافی

ہے خالی خولی محبت سے پیٹ نہیں بھر سکتا فی زمانہ خالی خولی محبت ایک احمقانہ حرکت ہے اس نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔محبت صرف دولت مندوں ہی کی میراث نہیں ہوتی۔اس نے اختلاف کیا۔غریبی کی میراث کیا ہوتی ہے ایک اپنا سڑا ہوا کھوکھلا وجود محبت جس کے پاس سے گزرتا بھی اپنی توہین سمجھتی ہے وہ زہر گل رہا تھا۔اسی کھوکھلے وجود سے تم نے کبھی محبت کی تھی اس کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ساتھ ٹپکے تھے اب نہیں ہے اس نے سکون سے کہا تھا۔تم میرے بنا بے چین ہو جایا کرتے تھے۔محبت میں یا دہانیوں کا موڑ آ گیا تھا۔مجھے شرمندگی ہے اپنی اس بے چینی پر، میں شرمندہ ہوں اپنی اس گزری ہوئی سوچ پر مجھے افسوس ہے اس محبت پر جو کبھی میں نے تم سے کی تھی اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔اپنی بے وقعتی کا احساس سامنے بھتے ہوئے وجود کو مارے ڈال رہا تھا مگر غصہ جس طرح سارے لطیف احساسات کو ختم کر دیتا ہے اور اپنے احساسات کے اظہار کے لیے اکساتا ہے وہ بھی سارے محسوسات کو زائل کر کے جنگ کے لیے تیار تھی۔نور تمہاری باتیں مجھے بے وقعت کر رہی ہیں۔اصولاً مجھے تم پر غصہ آنا چاہیے مگر ایسا نہیں ہے غصہ میری ذلت کا احساس دلائے گا۔جو مجھے منظور نہیں ہے۔

میرے ساتھ دوٹوک بات کرو،تم کس چیز سے فرار چاہتے ہو۔اس ملک سے رشتوں سے رشتوں کے دکھ سے مجھ سے یا میری بیماری سے تم کہاں جاؤ گے۔دنیا کے کس کونے میں اس ملک سے رشتوں سے فرار چاہتے ہو۔ان کو دکھ سے فرار چاہتے ہو تو یہ فرار تمہیں کبھی حاصل نہ ہو گا۔ہم تنہا زندگی نہیں گزار سکتے۔دکھ ہمیں دیکھ کیا تمہیں کوئی اسی جگہ مل سکتی ہے نور جس تم اپنائیت کے بغیر جی سکو تو میں کہوں گی کہ تم جھوٹے ہو۔تم کہتے کہ تمہیں مجھ سے فرار چاہیے تم میرا ساتھ نہیں چاہیے میں تمہیں پسند نہیں یا میری بیماری تمہیں خوفزدہ کرتی ہے مگر اس وقت مجھے تم مریض لگ رہے ہو۔آج پہلی دفعہ میں نے اپنے آپ کو صحت مند محسوس کیا ہے۔آج سے پہلے اپنی بیماری مجھے کمپلیکس میں مبتلا کرتی تھیں لیکن آج مجھے ایسا کوئی کمپلیکس نہیں ہے کیونکہ بیمار تو کوئی بھی ہو سکتا ہے یہاں کون بیمار نہیں ہے کیا تم مکمل ہو۔کیا تم ابھی حالت میں ایک مکمل شخص ہو۔اس نے اپنے سوال پر خود ہی نفی میں سر ہلایا تھا۔یہاں پر کون مکمل ہے سب ادھورے ہیں اگر سب نامکمل ہیں ادھورے ہیں تو ایک شخص کسغمیں دوسرے شخص کو ادھورا قرار دیتے ہوئے چھوڑ سکتا ہے کیسی مضحکہ خیز بات ہے ایک ادھورا شخص دوسرے ادھورے شخص سے یہ کہے کہ تم میرے قابل نہیں ہو ہے نا مضحکہ خیز بات اس نے اپنی آنکھ میں آئے آنسوؤں کو چھپانے کی ذرا سی بھی شعوری کوشش نہیں کی تھی۔شعور کا ساتھ صرف اتنا تھا کہ وہ بہہ رہے تھے اور وہ انہیں پونچھ رہی تھی۔

ایسی صورت حال میں نفرت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور پھر وہی روایتی سا جملہ کہا جاتا ہے کہ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔یا یہ کہ تم مجھے کیا چھوڑ دو گے میں خود تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔مگر میں ایسا ہرگز نہیں کہوں گی۔محض اس بنا پر تم سے نفرت کرنے لگوں کہ تم مجھے چھوڑ رہے ہو میری ذات کی نفی کر رہے ہو۔یہ تو میر خودغرضی ہو گی اور تمہارے ساتھ میں کبھی بھی خودغرض نہیں رہی ہوں نور!ہاں مجھے غرض تھی تو صرف تمہاری محبت سے،میں اپنی زندگی کی کسی ایک بھی غرض کو تمہاری محبت کے آگے نہیں آنے دیا محبت سے آگے کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی لیکن یہ بات تم نہیں جان سکو گے۔کیونکہ تم نے زندگی میں ہمیشہ ہر چیز کو محبت سے آگے رکھ کر سوچا ہے اب تمہیں جانا ہے تم جاؤ دنیا کے جس کونے میں بھی جاؤ۔وہاں کسی سے رشتہ مت جوڑنا۔اپنائیت کے احساس کو زائل کر کے جانا کہ رشتوں کا دکھ تم سے دیکھا نہیں جاتا۔کبھی ضمیر کی خلش میں مبتلا مت ہونا۔

احساس ندامت کو مار کے جانا وگرنہ تمہارے لیے مشکل ہو جائے گی اور جب ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے ضرور بتانا تمہاری خیر خواہ منتظر رہے گی۔ اس نے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے بیگ سے رومال نکالا تھا اپنی آنکھیں اور چہر کو صاف کرنے کے بعد رومال دوبارہ بیگ میں رکھنے کے بعد وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر اس نے ایک نظر اپنی رسٹ وچ پر ڈالی تھی گھڑی کی سوئیوں پر نظر پڑتے ہی اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور پلٹ گئی اور پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا ہر اٹھتا ہوا ایک قدم گنا تھا باہر نکلنے سے پہلے اس نے کس ہاتھ سے دروازہ کھولا تھا یہ بھی ان نظروں نے دیکھا تھا اب وہ نہیں تھی اس پورے منظر میں وہ اکیلا تھا اس نے ٹیبل پر پڑے ہوئے پیکٹ میں سے آخری سگریٹ نکال کر سلگایا تھا۔

بعض اوقات ہمیں اپنی کہی ہوئی بات کچھ عرصہ بعد غلط لگنے لگتی ہے اور کبھی کبھی کچھ لمحوں بعد ہی اپنے آپ پر غم جاتا ہے احساندامت حاوی ہو جاتا ہے اور احسازیاں بڑھنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی جو میری خودغرضی کے سامنے بھی مجھ سے نفرت نہیں کرتی۔ چھ برسوں کے کسی ایک دن بھی اس نے کبھی اپنی کوئی غرض میرے سامنے نہیں رکھی۔ دولت رشتے، محبت ان تینوں میں سے کس چیز سے فرار چاہتا ہوں اور کیا فرار ممکن ہے ہاں یہ سچ ہے میرے دل میں اسے کھو دینے کا خوف تھا۔ میں اس خوف سے بھاگ رہا تھا۔ سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی بائیک کو یک دم بریک لگے اس کے جانے کے بعد وہ مسلسل کئی گھنٹوں سے شہر کی سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ سچ یہ ہے ک میں ماریا سے محبت کرتا ہوں سچ یہ ہے کہ اگر زندگی میں ماریا نہیں ہو گئی تو نور کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں اسے منا لوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی اس نے ایک طمانیت بھرا پرسکون سانس لیا تھا پھر بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد اس کا رخ بھابھی کے گھر کی طرف موڑ دیا تھا۔ زندگی میں نئے رشتے بننے جا رہے تھے اور اب بھابھی کو اپنے گھر میں رہنا تھا۔

وہ ابھی اسکول سے چند لمحے پہلے ہی گھر آئی تھی۔ تب سے باہی بجتی ہوئی بیل کی آواز پر وہ دروازے تک گئی اور باہر کھڑے کوریئر سروس کے آدمی سے ایک خوب صورت سرخ گلابوں کا بوکے اور کارڈ وصول کرنے کے بعد وہ اندر آئی کارڈ پڑھے بغیر بھی وہ جان چکی تھی کہ یہ پھول کس نے بھیجے ہیں گزرے چھ برسوں میں وہ بات اچھی طرح جان چکی تھی کہ نور کبھی بھی اس سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا۔ وہ کارڈ کھول کر پڑھنے لگی۔ جب ناراضی ہوتی ہے خواہ لمحے بھر کے لیے ہی کیوں نہ ہوا اجنبیت پیدا کر دیتی ہے ہم بات کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں یہ ہچکچاہٹ میرے آڑے بھی آ رہی ہے مگر میں پھر بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آؤ اقرار کر لیں۔ آؤ دیکھتے ہیں کہ انکار کے بعد جب اقرار ہوتا ہے تو دل ملنے میں کتنا ٹائم لگتا ہے میں منتظر ہوں نور احمد۔ جب انکار کے بعد اقرار ہوتا ہے تو دل ملنے میں کتنا ٹائم لگتا ہے اس نے کارڈ پر لکھی ہوئی آخری تحریر کو ایک دفعہ پھر پڑھا اور پھر کھلے ہوئے کارڈ کی خوب صورت تحریر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید ایک منٹ یا شاید ایک بھی نہیں اور پھر ایک خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ سرخ گلابوں کو ریپر سے نکال کر اپنے گلدان میں میں سجانے لگی۔

☆☆☆☆

بزم سخن

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دل اس قدر اداس پہلے کبھی نہ تھا
غم میرا اک رفیق تو تھا، زندگی نہ تھا
بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت
جس شخص کی تلاش تھی، بس اک وہی نہ تھا

(محمد عزیز مے)

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جانا نہ
زندگی تیری عطا تھی سو تیرے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی تیرا احسان جانا نہ

(نسیم ناز۔۔۔۔حیدرآباد)

آج دنیا نے ستم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا
تیری باتیں تیرا انداز وفا یاد آگیا
کاش ہم تم کو منا لیتے نہ جانے دیتے
مدتوں بعد یہ احسان خطا یاد آیا

(محمد عزیز مے)

وہ پتھر جنہیں ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
جب ملی گویائی ہم ہی پر برس پڑے

(ایس حبیب خان----کراچی)

جنون عشق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج برہم نہیں ہے
میری بربادیوں کا ہم نشیوں----!
تمہیں کیا؟ مجھے بھی غم نہیں ہے

(عزیزمے)

اس کی باتوں کو بھلا دیں یہ ممکن ہی نہیں
اس نے جو بھی کہا رونما ہونے کو ہے
اس کے چہرے کی اداسی سے ہی ظاہر ہے کاوش
جیسے وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہونے کو ہے

(ملک این اے کاوش اعوان۔سلانوالی،سرگودہا)

رات کو جب بھی ماہتاب دیکھا تھا
میں نے تیرا ہی خواب دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو یہ محسوس ہوا مجھ کو
جیسے پھر ایک آفتاب دیکھا تھا

(ایچ ایم بلال اسلم،سلانوالی،سرگودہا)

دل کی آنکھ کھلتی ہے تو سراپا بدل جاتا ہے
محبت کی نظر سے انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے

(اے بی شاہین،سلانوالی،سرگودہا)

جب ابر ٹوٹ کے برستا ہے نوٹی

جب دل کے زخموں سے لہو رستا ہے
جب دل کی آگ آنکھ کو برساتی ہے
تم مجھے بہت یاد آتے ہو نونی

(نونی اعوان......رحمت کالونی)

اب تو اس کے بچھڑ جانے کا بھی ملال نہیں ہوتا
ادا ہر غم ہمیشہ پائیدار نہیں ہوتا
وہ بچھڑ گیا ہے تو یہ تقدیر کا فیصلہ تھا
وفا کے نام پر اب کوئی جذبہ بے دار نہیں ہوتا

(شہریار اسلم،رحمت کالونی)

خوشخبری

شاہین ڈائجسٹ میں جلد ہی کچھ نئے سلسلے شروع کیے جا رہے ہیں۔جن کے لیے مواد درکار ہیں۔اگر آپ ایک اچھے لکھاری ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں لیکن لکھ نہیں پا رہے تو اپنی تمام تر ہمت یکجا کر کے جو کچھ لکھ سکتے ہیں۔لکھ کر ہمیں ای میل،واٹس ایپ یا پھر بذریعہ خط بھیج دیجئے ہم اس کی نوک پلک سنوار کر اسے نزدیکی شمارے کی زینت بنائیں گے۔یہی نہیں اس کے علاوہ آپ ہمیں کہانیاں،افسانے،ناول،بچوں کی کہانیاں،مختصر کہانیاں،سو لفظی کہانیاں،نامور شخصیات کے انٹرویوز،لطیفے،اقوال زریں،معلومات اور ادب کے حوالے سے کچھ بھی بھیج سکتے ہیں۔معیاری مواد کو لازمی شائع کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں وہ احباب جو قسط وار کہانیاں شائع کروانے کے متمنی ہیں۔ایک بار پھر ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ قسط وار کہانیاں صرف ان احباب کی لگائی جائیں گی۔جن کی مکمل اقساط ہمارے پاس دستیاب ہوں گی۔ایک آدھ قسط بھیج دینے سے کہانی شائع نہیں کی جائے گی۔لہٰذا التماس ادب ہے کہ جلد از جلد اپنی تحریریں اور دیگر مواد ارسال کریں تا کہ نزدیکی شمارے میں آپ کے مواد کو شائع کیا جا سکے۔

شاہین ڈائجسٹ سے متعلق ہر قسم کی آرا و تجاویز کے لیے کسی بھی وقت فیس بک پہ ہمارے پیج یا ہمارے نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

محمد ندیم عباس میواتی(ایڈیٹر)

0334-7284018 / 0306-9034595

غزل

ٹھوکر لگی تو اپنے ہی مقدر پہ جا گرا
پھر یوں ہوا کہ آئینہ پتھر پہ جا گرا
احساس فرض جب بھی ہوا نیند آگئی
چلتا تھا پھر صراط پہ بستر پہ جا گرا
بازی محبتوں کی جہالت نے جیت لی
وہ بن گیا خطیب جو منبر پہ جا گرا
خوشبو قصور وار نہیں اس کو چھوڑ دو------
میں پھول توڑتے ہوئے کانٹوں پہ جا گرا
صحرا میں لیے پھرا اقبال پانی کی جستجو
جب پیاس مر گئی تو سمندر میں جا گرا

(انتخاب۔محمد عزیز مے)

------☆------

ہم نے خوشبو کی طرح دکھ بھی اکٹھے دیکھے
صفحہ زیست کو پلٹو گے تو یاد آؤں گا
اسی انداز میں ہوتے تھے مخاطب مجھ سے
خط کسی اور کو لکھو گے تو یاد آؤں گا
سرد راتوں کے مہکتے ہوئے سناٹے سے
جب کسی پھول کو چومو گے تو یاد آؤں گا
اب تو یہ اشک میں آنکھوں سے چرا لیتا ہوں
ہاتھ سے خود انہیں پونچھو گے تو یاد آؤں گا
شال پہنائے گا کون اب دسمبر میں تمھیں

تم یہ رنگ جو پہنو گے تو یاد آؤں گا

(ارسلان احمد، سرگودہا)

------☆------

بارشوں کی بوندوں نے
خشک سرد ہواؤں نے
دل میں بیتی یادوں کا
میلہ اک لگایا ہے
مجھ کو ایک بھیگا سا
لمحہ یاد آیا ہے
شاہ وہ جدائی کی
ڈوبتا ہوا سورج
دسمبر کی بارش میں
جب جدا ہوا تھا تو
ہاں------تیری جدائی کا
وہ لمحہ یاد آیا ہے

(ملک این اے کاوش، سلانوالی، سرگودہا)

------☆------

بہت زیادہ گفتگو کرتے نہیں ہم
آنکھ کے راستے گرتے نہیں ہم
سب شکایتیں خود سے ہیں
کسی کے آگے روتے نہیں ہم
نہیں ہے دام کسی کے پاس

کسی بھی مول بکتے نہیں ہم
اپنے رستے خود بناتے ہیں
کسی کے رستے چلتے نہیں ہم
دل کا سودا صرف تجھ سے ہے
کسی کے آگے جھکتے نہیں ہم
بہت برداشت ہے مجھ میں
آنسو صورت برستے نہیں ہم

(جاوید اقبال پرنس، اسلام نگر)

------☆------

غموں کی رانی ہے دوستوں
دل کی آگ بجھانی ہے دوستوں
اتنے اشک بہہ جاتی ہیں آنکھوں سے
لوگ سمجھتے ہیں کہ پانی ہے دوستوں
جس خوشبو کا میں پاگل ہوں
یہی تو رات کی رانی ہے دوستوں
جو دل سینے سے لگائے بیٹھا ہوں
یہی اس کی نشانی ہے دوستوں

(حمزہ فیروز، مکہ کالونی)

ہم جن سے امید وفا کرتے رہے
وہ ہمیں رسوا سر بازار کرتے رہے
ہم جن کی زندگی کے لیے دعا مانگتے تھے ہر وقت
وہ ہماری موت کی دعا صبح و شام کرتے رہے

اب غم کے ماروں کا ساتھ دے بھی تو کون
ہم کو اپنے ہی دکھ بے حساب دیتے رہے
اب دنیا والوں پہ یقین کریں بھی تو کیسے طلحہ
دنیا والے تو ہم پہ ظلم کی انتہا کرتے رہے

(طلحہٰ فیروز۔مکہ کالونی)

میری نگاہیں ڈھلتا سورج
تیری راہیں ڈھلتا سورج
آج بھی تیرا راستہ دیکھیں
پیاسی آنکھیں ڈھلتا سورج
اب بھی تیرے لیے ہیں بے کل
ترستی بانہیں ڈھلتا سورج
اب بھی تیرے لیے بھرتا ہے
ٹھنڈی آہیں ڈھلتا سورج
کل سی مجھ کو یاد ہیں اب بھی
مدغم سانسیں ڈھلتا سورج
آج بھی آنکھ میں وہ منظر ہیں
تیری زلفیں ڈھلتا سورج
بولی میرے دوست ہیں اب بھی
سسکتی سانسیں ڈھلتا سورج

(محمد عزیزؔ)

اسے کہہ دو! دل کو نہ ستائے میرے
سونے دے خوابوں میں نہ آئے میرے
میں کس طرح غم کو سمجھائے ہوئے ہوں

سبھی راز نہ لوگوں کو بتائے میرے
یاد ماضی غموں کو بھلانے دو مجھے
اب نہ کوئی محبت کے گیت سنائے مجھے
نہ جانے کس دیس میں جا بسے ہو
تھک گئی ہوں لوٹ آشیاں میں میرے
ہجر میں جل رہی ہوں اکیلی بیناخ
کون ہے جو سینے سے لگے میرے

خوشخبری

شاہین ڈائجسٹ میں جلد ہی کچھ نئے سلسلے شروع کیے جارہے ہیں۔جن کے لیے مواددرکار ہیں۔اگر آپ ایک اچھے لکھاری ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں لیکن لکھ نہیں پار ہے تو اپنی تمام تر ہمت یکجا کر کے جو کچھ لکھ سکتے ہیں۔لکھ کر ہمیں ای میل ،واٹس ایپ یا پھر بذریعہ خط بھیج دیجئے ہم اس کی نوک پلک سنوار کرا سے نزدیکی شمارے کی زینت بنائیں گے۔یہی نہیں اس کے علاوہ آپ ہمیں کہانیاں،افسانے،ناول،بچوں کی کہانیاں،مختصر کہانیاں،سولفظی کہانیاں،نامور شخصیات کے انٹرویوز،لطیفے،اقوال زریں،معلومات اورادب کے حوالے سے کچھ بھی بھیج سکتے ہیں۔معیاری مواد کولازمی شائع کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں وہ احباب جوقسط وار کہانیاں شائع کروانے کے متمنی ہیں۔ایک بارپھران کوآگاہ کیا جارہاہے کہ قسط وار کہانیاں صرف ان احباب کی لگائی جائیں گی۔جن کی مکمل اقساط ہمارے پاس دستیاب ہوں گی۔ایک آدھ قسط بھیج دینے سے کہانی شائع نہیں کی جائے گی۔لہٰذا التماس ادب ہے کہ جلداز جلداپنی تحریریں اور دیگر موادارسال کریں تا کہ نزدیکی شمارے میں آپ کے مواد کوشائع کیا جاسکے۔

شاہین ڈائجسٹ سے متعلق ہرقسم کی آراءوتجاویز کے لیے کسی بھی وقت فیس بک پہ ہمارے پیج یا ہمارے نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

محمد ندیم عباس میواتی (ایڈیٹر)

0334-7284018 / 0306-9034595

خونی حویلی



خونی حویلی

تحریر:عثمان رضا......اوکاڑہ

ادارے کی پالیسی کے مطابق نام اور مقامات سب فرضی ہیں کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

ہیبت خان تیرہ برس بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔وہ عرصہ دراز سے لندن میں مقیم تھا۔اس نے لندن میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر ہوم جاب کرنے کے بعد وہیں کا ہوکے رہ گیا۔جلد ہی اس کا شمار اچھے ڈاکٹروں کی لسٹ میں ہونے لگا تھا۔اس کی شادی کے دو سال بعد اس کا باپ یکبارگی دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے لقمۂ اجل ہوگیا۔ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کی موت شدید خوف کی وجہ سے واقعہ ہوئی ہے لیکن گھر کے اندر کوئی ایسا واقعہ بھی رونما نہ ہوا تھا۔جسے بنیاد بنا کر اس بات کو سچ تسلیم کیا جا سکتا۔

ہیبت خان کا باپ وجاہت خان اپنے علاقے کا وڈیرہ گردانا جاتا تھا۔علاقے کے اندر سب سے بڑی حویلی جاہت خان کی ہی تھی۔علاوہ ازیں وجاہت خان ساڑھے چار مربع زمین کا مالک تھا۔اس کی وفات کے بعد سب کچھ ہیبت خان کے کنٹرول میں آگیا تھا۔چار کنال کی اراضی میں چار دیواری ڈال کر ایک سائیڈ پر ایک کنال پر عظیم الشان کوٹھی تعمیر کروائی گئی تھی جبکہ اس کے بالکل سامنے ایک کنال پر چھوٹا سا گراؤنڈ نما پارک بنایا گیا تھا۔ساتھ والی دو کنال جگہ میں حویلی کے بالکل پیچھے ملازموں کے لیے کوارٹر بنوائے گئے تھے۔جبکہ ایک سائیڈ پر ایک چھوٹا سا قبرستان بنایا گیا تھا۔جہاں وجاہت خان کے والدین اور بہن کو دفن کیا گیا تھا۔

وجاہت خان اپنے وقت کا ایک ظالم،جابر اور بے غیرت قسم کا انسان گزرا تھا۔پیسہ اور حسن دونوں ہی وجاہت خان کی کمزوریاں تھیں۔کتنی ہی معصوم اور بے گناہ دوشیزاؤں کی عصمت کا اس نے جنازہ نکالا تھا۔غریب لوگوں کے اندر اس کے خلاف زبان کھولنے کی سکت نہ تھی۔اس کے ظلم کی انتہا تو اس وقت ہوئی جب اس کی حویلی میں رانا الفت نے آنا شروع کر دیا۔

رانا الفت کا تعلق انڈر ورلڈ کی دنیا سے تھا۔شروع میں اس نے وجاہت خان کے ذریعے منشیات فروشی کے دھندے کو فروغ دیا جب اس کا وجاہت خان پر اعتماد پیدا ہوگیا تو اس نے وجاہت خان کے ذریعے نوجوان دوشیزاؤں کو اغواء کروانا شروع کر

دیا۔ پیسہ پہلے ہی وجاہت خان کی کمزوری تھا۔رانا الفت نے وجاہت خان کوسر سے پاؤں تک پیسے میں چھپا دیا تھا۔وجاہت خان نے بھی رانا الفت پرحد سے زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وجاہت خان اس بات سے قطعی آشنا نہ تھا کہ رانا الفت کس قدر آتش کا پرکالا ہے۔رانا الفت وجاہت خان پر پیسے کی بارش کر رہا تھا تو دوسری طرف وجاہت خان اپنے چیلوں کے ذریعے اسے لڑکیاں پہنچا رہا تھا۔لیکن ایک رات وجاہت خان دل کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے خالق حقیقی سے جا ملا۔

باپ کی وفات کے بعد ہیبت خان اپنی فیملی سمیت لندن شفٹ ہو گیا تھا۔پیچھے کا سارا نظام اس نے منشی فیض رسول کے سپرد کر دیا تھا۔لندن رہ کر وہ وقتاً فوقتاً منشی فیض رسول سے حالات وواقعات کے متعلق آگاہی لیتا رہتا تھا۔منشی فیض رسول ایک نہایت ہی ایماندار اور قابل اعتماد انسان تھا۔

خالق حقیقی نے اسے تین بچوں سے نوازا تھا۔سب سے بڑا بیٹا راشد خان جو کہ اب میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا۔اس سے چھوٹا بیٹا ظہیر خان چھٹی کلاس میں پڑھ رہا تھا جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا حیدر خان چوتھی کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ہیبت خان کی اہلیہ مونا خان نے ایم اے انگلش کیا ہوا تھا اور لندن مین ہی ایک پرائیویٹ فرم میں بطور سیکرٹری خدمات سرانجام دے رہی تھی۔

وقت پر لگا کے گزرتا چلا گیا اور تیرہ سال کا طویل عرصہ پلک جھپکتے میں بیت گیا۔تیرہ برس بعد ہیبت خان اپنی فیملی کے ساتھ واپس اپنے گاؤں آرہا تھا۔تیرہ برس بعد جب وہ اپنے علاقے میں داخل ہوا تو اسے حیرت ہوئی۔اسے یوں لگا جیسے دنیا ہی بدل گئی ہو۔کچی آبادی پکی عمارتوں کا روپ دھار چکی تھی۔گاؤں کا گاؤں شہر میں بدل چکا تھا۔ضرورت زندگی کی ہرسہولت دستیاب تھی۔اس کے تخیل میں وہ گاؤں آیا جب یہاں کچی آبادیاں تھیں لیکن آج یہ تبدیلی دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

ہیبت خان اور اس کی فیملی کو لینے کے لیے منشی فیض رسول ایئرپورٹ پر آیا تھا۔منشی فیض رسول کو جب اس نے دیکھا تھا تو وہ بالکل جوان تھا لیکن آج اس کے بالوں میں سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی اس سے پنہاں نہ تھی۔

''آپ کی زندگی کا سورج بھی ڈھلتا جارہا ہے۔''ہیبت خان نے منشی فیض رسول کو راستے میں چھیڑتے ہوئے کہا تو سب کی ہنسی نکل گئی۔

''یہ سفیدی ایسے ہی نہیں آگئی۔''منشی فیض رسول نے بتایا۔''آپ لوگوں نے میرے ناتواں کندھوں پر بہت بڑا بوجھ لاد دیا تھا۔ہروقت چنتا کھائے رہتی تھی کہ کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے۔زندگی میں آج تک آپ کے باپ دادا سے بھی دھوکہ نہیں کیا تھا۔''

''آپ کی وفاداری کا میں بچپن سے ہی قائل ہوں۔''ہیبت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ سب آپ کی محبت ہے۔''منشی فیض رسول گاڑی حویلی کے اندر داخل کرتے ہوئے بولا۔

گاؤں میں ہیبت خان اور اس کی فیملی کی واپسی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔سب لوگ اس کا استقبال کرنے کی

غرض سے اس کی حویلی میں مجتمع تھے۔عین اس وقت جب گاڑی حویلی میں داخل ہوئی سب گاؤں والے گاڑی کے آلے دوالے (چہار سو) پھیل گئے تھے۔ ہیبت خان اور اس کی فیملی جب گاڑی سے باہر نکلے تو گاؤں والوں نے ان پر پھولوں کی پتیوں کی بارش کر دی۔ ہیبت خان گاؤں والوں کی چاہت اور محبت کا گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ گاؤں والے جلد ہی یکے بعد دیگرے لوٹ گئے۔

شام کے دھندلکوں نے جب ہر شے کو اپنی آغوش میں بھرنا شروع کر دیا تو جنوب کی جانب سے گہرے سرخ بادلوں نے اٹھنا شروع کر دیا۔ گہری تاریکی کے باعث بادلوں کی رنگت کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ بادل خاموشی سے نیلے فلک پر چھا رہے تھے۔ جیسے جیسے کچھوے کی رفتار سے بادل چھا رہے تھے۔ ویسے ویسے ماحول میں بے چینی اور گھبراہٹ اور حبس بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ حبس جیسے جیسے بڑھ رہی تھی۔ ہر کس و ناکس مضطرب ہونے لگا تھا۔

حبس بے جا کی وجہ سے لوگ گھروں سے باہر نکلنے یا چھتوں پر چھڑنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر کوئی فرق محسوس نہ ہوا تھا۔ سب کی حیرت ہویدا تھی کہ نجانے آج ماحول میں اتنی حبس کیوں بڑھ چکی تھی۔ تبھی یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر تو سب کے پیروں تلے زمین کھسک گئی کہ بارش کے قطروں میں پانی کی بجائے خون کی بوندیں اور لوتھڑے گر رہے تھے۔ جس جس نے بھی یہ منظر دیکھا تو فوراً سے بھی پہلے پروردگار کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ استغفار کا ورد شروع ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آسمان سے خون گرنے کی وجہ کیا ہے؟

دوسری طرف سفر کی تھکاوٹ کے باعث ہیبت خان اور اس کی فیملی جلد ہی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے لیکن انہیں سوئے ابھی تھوڑی ہی دیر بیتی ہو گی کہ یکدم سکوت زدہ فضا میں دلخراش چیخیں گونج اٹھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک ساتھ درجنوں لوگ چیخ و پکار کر رہے ہوں۔ ہیبت خان اور اس کی ساری فیملی سہم گئے۔ ہیبت خان کے بچے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ہیبت کان نے فوراً ہی منشی فیض رسول کو اپنے کمرے میں بلوا لیا اور ان چیخوں کے بارے میں دریافت کیا مگر وہ خود کچھ جانتا ہوتا تو اسے کچھ بتاتا۔

''معذرت چاہتا ہوں سرکار۔'' منشی فیض رسول بے چارگی کے عالم میں بولا۔ ''پوری حویلی چھان ماری ہے لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ آوازیں حویلی کے کس حصے سے آ رہی ہیں۔ نہ ہی یہ پتہ چل رہا ہے کہ چیخ کون رہا ہے؟''

منشی فیض رسول کی بات سن کر ہیبت خان سمیت اس کی فیملی حیران رہ گئے۔

''تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ہیبت خان نے منشی فیض رسول کو حیران کن انکھیوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''فوراً سے بھی پیشتر مجھے وضاحت چاہیے۔''

ہیبت کا لہجہ تحکمانہ لیکن حیرت والا تھا۔ اسے منشی فیض رسول کی ذہنی حالت پر حیرت ہو رہی تھی۔ ہیبت خان کا حکم سنتے ساتھ ہی منشی فیض رسول نے مڑنا چاہا ہی تھا کہ یک لخت آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

''تم جا سکتے ہو لیکن یا د رکھنا ایک تو اب کوئی خلل بر داشت نہیں کروں گا دوسرا اس واقعے کی مکمل تحقیقات کرواؤ مجھے صحیح وضاحت چاہیے۔''

منشی فیض رسول منہ سے تو کچھ نہ بولا بس سر ہاں میں ہلاتا ہوا چپ چاپ دبے قدموں واپس لوٹ گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑھا عقل سے پیدل ہے۔''مونا خان لیٹتے ہوئے بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ہیبت خان نے منشی فیض رسول کی حمایت میں کہا۔

''کیا یہ حیرت زدہ بات نہیں ہے کہ ایک عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا اور حویلی کا خاص بندہ بونگوں کے سے جواب دے۔''مونا خان بولی۔

''چھوڑو اس بات کو سو جاؤ۔'' ہیبت خان لا جواب ہو کر بولا۔''بچوں کو بھی سلاؤ ایسی باتوں سے بچوں کے ذہنوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔''

مونا خان منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن خوف کی ایک سر دلہر اس کے پورے شریر میں سرایت کر چکی تھی۔اس نے بچوں کو ساتھ لٹالیا تھا۔لیکن یوں لگتا تھا جیسے نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔اس کی چھٹی حس اسے انجانے ،ان دیکھے خطروں سے آگاہ کر رہی تھی۔بے شک جس ماحول کے وہ عادی تھے۔وہاں ان باتوں کو حقیقت تصور نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ ذہنی فتور تصور کیا جا تا تھا۔لیکن جو کچھ بھی تھا اس نے مونا خان کو سوچنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

منشی فیض رسول کے ساتھ مل کر روزانہ ہیبت خان نے اپنی زمینوں کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔بچوں کو تین ماہ کی چھٹیاں تھیں۔اور اس بار اس نے یہ چھٹیاں اپنے گاؤں میں گزارنے کا ارادہ بنایا تھا۔ہرطرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔منشی فیض رسول کی ایمانداری اور محنت کا ہیبت خان مزید گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا۔منشی فیض رسول نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔زمینیں سونا اگل رہی تھیں۔اس کے علاوہ ہرطرف قد آور درخت دکھائی دے رہے تھے۔

انہی درختوں میں ایک بیر کا درخت بھی تھا جس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی اور جھکی ہوئی تھیں۔منشی فیض رسول اور ہیبت خان دونوں چلتے ہوئے اس درخت تک جا پہنچے۔

''سرکار اس درخت کا پھل بہت میٹھا اور رسیلا ہے۔''منشی فیض رسول نے بتایا تو ہیبت خان نے درخت کو بغور دیکھا۔''پھل دار درختوں کے پھل وقتاً فوقتاً گاؤں والوں میں تقسیم کرواتا رہتا ہوں۔غرباء میں اناج بھی تقسیم کرواتا رہتا ہوں۔''

''ہوں۔'' ہیبت خان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے خوشی سے کہا۔''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔اللہ پاک رزق میں برکت پیدا کرتے ہیں۔ویسے بھی یہ ہماری رعایا ہے۔اگر ہم نے ان کا خیال نہیں رکھنا تو اور کس نے رکھنا ہے۔اگر ہم لوگ ان کا خیال

نہیں رکھیں گے تو ہم سے بھی پوچھ گچھ ہوگی ۔جس قدر ممکن ہو گاؤں کے غریب ضرورت مند لوگوں کی ہر ضرورت پوری کیا کرو یہی نہیں گاؤں سے باہر کا بھی کوئی آجائے تو کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے۔''

''ایسا ہی ہوگا سرکار۔''منشی نے جواب دیا۔

ہیبت خان نے درخت کی ایک لٹکی ہوئی شاخ کو پکڑ کر اس سے ایک موٹا تازہ بیر توڑا لیکن بیر توڑنے کی دیر تھی کہ اگلا منظر دیکھ کر ہیبت خان سمیت منشی فیض رسول بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گیا ۔جس ٹہنی سے بیر توڑا گیا تھا۔اس جگہ سے خون کی بوندیں ٹپکنا شروع ہوگئی تھیں ۔ ہیبت خان نے حیران کن اکھیوں سے منشی فیض رسول کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بیر سرعت سے ایک طرف پھینک دیا۔منشی فیض رسول سرعت سے ہیبت خان کی اور بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے یوں لگا جیسے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی ہو۔ بارش کیا تھی خون کی بوندیں پورے درخت سے ٹپک رہی تھیں ۔ ہیبت خان وار منشی فیض رسول دونوں ہی پوری طرح سے خونی بارش کی زد میں آچکے تھے ۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلتا جارہا تھا۔ بڑی ہی مشکل سے ایک دوسرے کو سہارہ دیتے ہوئے دونوں اس بیر کے درخت کے نیچے سے نکلے ۔لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت ہو یدا رہ گئی کہ ان کے درخت سے نکلتے ساتھ ہی خونی بارش یکدم تھم گئی ۔ یہی نہیں ان کے کپڑے اور جسم یکدم یوں خشک اور صاف ہو گئے جیسا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے ۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' ہیبت خان نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

ہیبت خان پوری طرح سے خوف کی زد میں آچکا تھا۔اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی ۔بس وہ متواتر منشی فیض رسول کو تکے جارہا تھا۔منشی فیض رسول خود انگشت بدنداں رہ گیا تھا کہ یہ سب ہو کیا گیا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں سرکار میں خود کچھ بھی نہیں جانتا۔''منشی فیض رسول کے لہجے سے بے بسی اور بے چارگی عیاں تھی ۔''لیکن حالات وواقعات بتارہے ہیں کہ یہ سب کالے جادو کا کوئی کھیل ہے ۔ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ وجلال اور مرتبے سے جیلس ہوتا ہو۔آپ کی کامیابی اس کے دل پر نشتر کے جیسے پڑتی ہو اور اس نے آپ پر زبردست کالا جادو کروا دیا ہو۔''

''یہ سب بکواس ہے ۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' ہیبت خان غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولا ۔

''سرکار ایسی باتیں نہ کریں۔''منشی فیض رسول نے تڑپ کر کہا۔''ایسے حالات وواقعات کو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ حالات یہی بتارہے ہیں دال میں ضرور کچھ کالا ہے ۔کسی اللہ والے سے ضرور حساب کتاب کروالینا چاہیے۔''

''لگتا ہے واپس آکر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' ہیبت خان نے بے بسی سے کہا۔''میری فیملی کے اندر خوف بڑھتا جارہا ہے ۔ مجھے اپنی فیملی بہت پیاری ہے ۔انہیں اس حال میں میں نہیں دیکھ سکتا اگر مزید کوئی ایسا واقعہ ہوا تو میرا یہاں رکنا ناممکن ہو جائے گا۔''

منشی فیض رسول کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔اس لیے اس نے چپ ہی رکھی۔دونوں چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ ہیبت خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جبکہ منشی فیض رسول اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ ہیبت خان نے گاڑی حویلی کی اور موڑی اور اسے گیئر میں ڈال دیا۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے ......؟

☆...... ☆...... ☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ ہر کوئی گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہیبت خان کی حویلی میں بھی گہرا سکوت طاری تھا۔ سارے مکین گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ ہیبت خان اور اس کی اہلیہ مونا خان الگ جبکہ تینوں بچے الگ کمرے میں سوتے تھے۔

تینوں بھائی گہری نیند سو رہے تھے۔ جب یکبارگی ظہیر خان کی آنکھ کھٹکے سے کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ کمرے کے اندر زیرو کے بلب کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جو ہر شے کو مکمل واضح تو نہیں کر رہی تھیں مگر اتنا ضرور تھا کہ چیز کی پہچان بغور دیکھنے سے کی جاسکتی تھی۔ظہیر خان ہمہ تن گوش ہوگیا۔آواز اٹیچ باتھ کے اندر سے آرہی تھی۔ باتھ کے اندر پڑے ٹب مین پانی گر رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اندر نہا رہا ہو۔

ظہیر خان نے اپنے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر رہ گیا۔ کیونکہ اس کے دونوں بھائی اس کے ساتھ بیڈ پر دراز تھے۔ظہیر خان کی حیرت ہویدا رہ گئی۔اس کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگ گئی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔اس نے نگاہیں اٹھا کر کمرے کے دروازے کو دیکھا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت بڑھ گئی کہ دروازے کی اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔

ظہیر خان بنا آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باتھ روم کے دروازے کے پاس جا کر اس نے کان لگا کر سننا چاہا لیکن کسی نتیجہ خیز مرحلے پر نہ پہنچ سکا۔ باتھ روم کے دروازے کی اندر سے چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ظہیر خان نے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ٹب کے اندر پیہم پانی گر رہا تھا۔لیکن نہانے والا کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظہیر خان باتھ روم کے اندر داخل ہوگیا لیکن اندر کوئی ہوتا تو اسے دکھائی دیتا۔

ظہیر خان نے پانی بند کیا اور باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی مڑا تھا۔کسی نے اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا۔ظہیر خان نے سہم کر فوراً پیچھے دیکھا لیکن یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔قبل اس کے کہ وہ واپس پلٹتا کسی نے یک لخت اس کی گردن سے پکڑا اور نیچے دھکیل دیا۔ظہیر خان اس افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ظہیر خان لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل زمین پر گرتا چلا گیا۔خود کو آہنی شکنجوں سے نجات دلانے کے لیے ظہیر خان ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔اس کی گردن پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چیخنا چلانا چاہتا تھا تا کہ مدد کے لیے اپنے بھائیوں کو بلائے لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک گئی ہو۔

حیرت وخوف کے مارے اس کے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ یکدم اس کے سر کو پکڑ کر کسی نے سرعت سے پانی سے بھرے ٹب میں ڈبو دیا۔ظہیر خان ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔اس کے ناک منہ میں مکمل پانی بھر چکا تھا۔سانس تک لینا دشوار ہو چکا تھا۔موت کی پر چھائیاں اس پر سایہ فگن ہو چکی تھیں۔اس کی ہر کوشش دھیرے دھیرے ناکام پڑتی جا رہی تھی۔زندگی اور موت کے درمیان وہ پنڈولیم کی طرح لٹک کر رہ گیا تھا۔اسی کشمکش میں اس کی ہر سعی ناکام پڑ گئی اور ظہیر خان لقمۂ اجل ہو گیا۔موت زندگی پر حاوی آ گئی۔ظہیر خان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ظہیر خان کا بے جان جسم لڑھک گیا۔

☆......☆......☆

ایک ساعت شکن چیخ نے وری حویلی میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا۔ چیخ کسی اور کی نہیں بلکہ راشد خان کی تھی۔راشد خان اٹھ کر باتھ گیا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ساعت شکن چیخ اس کے حلق سے نکلی۔حیدر خان جو کہ ابھی تک خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔راشد خان کی چیخ پر حیدر خان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اور وہ بھی فوراً باتھ روم کی طرف بڑھا۔اگلا منظر دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے بھی طوطے اڑ گئے۔دوسری طرف چیخ کی آواز سن کر بیبت خان اور مونا خان بھی ان کے کمرے کی اور بڑھے اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

دونوں بھائیوں کے رونے کی آوازیں پیہم ان کی ساعت سے ٹکرا رہی تھیں۔راشد خان تو ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر دھواں دھار روئے جا رہا تھا۔حیدر خان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔دروازہ کھلتے ساتھ ہی بیبت خان اور مونا کے علاوہ اکٹھے ہو جانے والے ملازم بھی اندر داخل ہو گئے۔

''ابو۔''حیدر خان نے روتے ہوئے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔''بھیا''

حیدر خان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔دونوں میاں بیوی جب باتھ روم کی طرف بڑھے تو اگلا منظر دیکھ کر ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔جو منظر ان کے سامنے تھا اسے دیکھ کر انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا۔اتنی دیر میں منشی فیض رسول بھی پہنچ گیا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر بیبت خان کو دلاسہ دیا جبکہ ملازموں کو فوراً حکم دے کر ظہیر خان کے جسدِ خاکی کو بیڈ پر لٹایا گیا۔پلک جھپکتے میں پوری حویلی میں ماتم شروع ہو گیا تھا۔مونا خان کا رو رو کر برا حال تھا۔حیدر خان اور راشد خان بھی دھواں دھار رو رہے تھے۔

ظہیر خان کی موت کی خبر پورے گاؤں میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔گاؤں والے یکے بعد دیگرے اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔پورا گاؤں جہاں بیبت خان اور اس کی فیملی کے غم میں شریک تھا۔وہیں حیران وششدر بھی تھا کہ ظہیر خان کی موت کیسے واقع ہو گئی؟ یہ معمہ کسی طور حل نہیں ہو پا رہا تھا۔رو رو کر سب کا برا حال تھا۔

لیکن کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا بلکہ یہ ایک دستور ہے۔انسان ہمہ وقت آنکھوں سے دکھائی

دینے والی حقیقتوں کو نہیں مانتا۔ایک ماں بچے سے اتنی محبت کرتی ہے کہ وقت آنے پر اپنی اولاد کی خاطر سولی پر لٹکنے سے بھی گریز نہیں کرتی لیکن جب اس کی اولاد لقمۂ اجل ہو جائے تو اس کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔کیونکہ وہ اس کے ساتھ اس کی قبر میں نہیں جاتی۔دنیاوی رشتہ دنیا میں ہی کھو جاتا ہے۔بس ایک یاد بن جاتا ہے۔ایسے ہی ایک باپ جو تا حیات اپنی اولاد کے روشن مستقبل کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگائے پھرتا ہے۔اپنی اولاد کے ساتھ قبر میں کیوں نہیں اترتا۔بھائی جو بھائیوں کی جان ہوتے ہیں۔ان کی محبت بھی دنیا میں رہ جاتی ہے۔کہتے ہیں کہ بہنیں ماؤں سے زیادہ اپنے بھائیوں سے محبت کرتی ہیں لیکن قبر میں وہ بھی ساتھ نہیں جاتی۔تو کیوں ہم حقیقتوں کو سمجھنے سے انکاری ہیں کہ یہ سب دنیاوی رشتے ہیں۔اصل رشتہ تو اللہ اور اس کے پیارے حبیبﷺ کا ہے۔جس نے بھی اللہ اور اس کے پیارے حبیبﷺ سے پکا رشتہ اپنا لیا اس کے لیے دنیا بھی بہتر اور آخرت بھی۔ماں باپ بہن بھائیوں کے درمیان رہنے والا انسان جب مر جاتا ہے تو اسے منوں مٹی تلے دفن کرنے کے بعد کوئی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ قبرستان کو روحوں کا بسیرا قرار دے دیا جاتا ہے۔کیا وہ روحیں ہمارے ان اپنوں کی نہیں ہوتی جو کبھی ہمارے درمیان ہوتے ہیں......؟

ہم لوگ اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے نجانے کتنے پاپڑ بیلتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچا کہ اولاد کا بہتر مستقبل اچھا گھر، کام اور اچھا رشتہ نہیں ہے۔بلکہ بہتر مستقبل مرنے کے بعد کا ہے۔لیکن موت کسے یاد ہے۔قبرستان میں جائیں یا کسی کی فوتگی پہ جائیں تو مومن بن جاتے ہیں جبکہ بعد میں رات گئی بات گئی والی بات بن جاتی ہے۔

آنسو، بہت بے رحم ہوتے ہیں۔جب بہتے ہیں تو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو انسان کا ہمت و حوصلہ تک بہا کر لے جاتے ہیں۔لیکن جب دل کا غبار نکل جاتا ہے تو انسان کی کیفیت بدل جاتی ہے۔اسے سکون میسر آ جاتا ہے۔صبر بھی مل جاتا ہے لیکن کچھ گھاؤ ایسے ہوتے ہیں جو دل و دماغ میں چھید کر کے رکھ دیتے ہیں اور کبھی نہیں بھرتے۔

ہیبت خان اور اس کی فیملی رونے دھونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے۔مجرم کافی شاطر تھا جسے بند دروازے بھی اندر داخل ہونے سے نہ روک پائے تھے۔نہ جانے وہ کن کونوں کھدروں سے اندر داخل ہوا تھا اور ظہیر خان کو ابدی نیند سلا کر چلتا بنا تھا۔ظہیر خان کو سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔پلک جھپکتے میں ہیبت خان کے گھرانے کو مصیبتوں نے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کو لے کر یہاں کیوں آیا تھا لیکن اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ مجرم کو ابدی نیند سلائے بنا یہاں سے نہیں جائے گا۔مجرم نے بے دردی سے اس کے لخت جگر کو ابدی نیند سلایا تھا۔ہیبت خان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ایک بار مجرم سامنے آ جاتا تو وہ اس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتا۔

☆......☆......☆

''یہ گھر کتنا منحوس ہے میرے لخت جگر کو نگل گیا ہے۔''مونا خان نے روتے ہوئے کہا۔

اس وقت سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ ہر کس و نا کس کی آنکھوں سے گو ہر ہائے آبدار بہہ رہے تھے۔ جوان بیٹے کے غم نے ہیبت خان اور اس کی اہلیہ کو نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ راشد خان اور حیدر خان کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔

''مما بھیا کو آخر کس نے مارا ہے؟'' راشد خان نے سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اندر سے تو چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں بھائی بھی سو رہے تھے۔ آخر مجرم کہاں سے آیا؟''

''ہمیں واپس چلے جانا چاہیے ابو۔'' حیدر خان نے ہیبت خان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آپ کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جو ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا بیٹا ہم اس طرح کیسے تمہارے بھائی کے مجرم کو زندہ چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟'' ہیبت خان گویا ہوا۔

''اس طرح تو مجرم کا حوصلہ مزید بڑھ جائے گا۔ وہ ہمیں بزدل سمجھے گا۔ اور یوں وہ کوئی بڑا وار بھی کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ میں اپنے لخت جگر کا اس سے انتقام لیے بنا جانے والا نہیں ہوں۔''

''ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ و جلال سے جیلس ہوتا ہو اور آپ کو نیچا دکھانے یا آپ کا سب کچھ ہڑپ کرنے کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہا ہو؟'' مونا خان نے سوال داغا تو ہیبت خان سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

اسے منشی فیض رسول کے الفاظ یاد آ گئے جب اس نے پیر توڑا تھا اور درخت سے خون کی بارش شروع ہو گئی تھی تو منشی فیض رسول نے کہا تھا کہ ممکن ہے کوئی آپ کے جاہ و جلال سے جیلس ہو رہا ہو۔

''ممکن ہے۔'' ہیبت خان نے مختصر سا جواب دیا۔

''اپنے دشمن کو پہچانیے وگرنہ وہ گاہے بگاہے وار کرتا رہے گا اور نقصان پہنچاتا رہے گا۔'' مونا خان بولی۔ ''میں مزید کچھ بھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ پہلے ہی کلیجہ چھلنی چھلنی ہو چکا ہے۔''

اتنا کہہ کر مونا خان سسکیاں بھرنے لگیں۔ ہیبت خان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جلد اپنے دشمن کو پکڑ کر ایسی موت مارے گا کہ دوبارہ کسی میں اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں ہوگی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ منشی فیض رسول کی بات پر عمل کرتے ہوئے کسی سیانے گیانے بندے سے صلاح مشورہ کرے اور حساب کتاب کروا کر اپنے دشمن کی پہچان کرے۔

☆......☆......☆

''تمہارے گھر کے اندر مافوق الفطرت مخلوق کا بسیرا ہے۔'' محمد حنیف بولا۔

ہیبت خان نے منشی فیض رسول سے بات کی تھی کہ وہ اسے کسی عامل باعمل کے پاس لے جائے۔ تھوڑی تگ و دو کے بعد انہیں محمد حنیف کا پتہ چلا۔ محمد حنیف ان کے گاؤں سے تین گاؤں چھوڑ کے 169 شمالی میں رہتا تھا۔ محمد حنیف کے پاس نوری علم تھا۔

جب ہیبت خان نے محمد حنیف کو ساری بات سے آگاہ کیا تو اس محمد حنیف نے آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر ورد کیا اور پھر جو اسے بتایا اسے سن کر ہیبت خان سمیت منشی فیض رسول کے پیروں تلے سے بھی زمین کھسک گئی تھی۔ ہیبت خان ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب فرضی اور ڈرامائی حد تک باتیں ہیں۔محمد حنیف کی بات نے اسے حیران کر دیا تھا۔''یہ کیسے ممکن ہے۔اس سائنسی دور میں ان باتوں پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے؟''

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ سائنسی دور کا مخلوقات سے کیا تعلق ہے؟''محمد حنیف پیچ و تاب کھا کر بولا۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ سائنس ایسی مخلوق کی موجودگی کو نہیں مانتی۔'' ہیبت خان نے وضاحت کی۔

''ویسے کتنی حیرت کی بات ہے۔''محمد حنیف ہونٹ بھینچتے ہوئے افسردہ سے لہجے میں گویا ہوا:''ہم لوگ بھی نام کے ہی مسلمان رہ گئے گئے۔ جب اللہ تعالیٰ عزوجل اپنی مقدس کتاب میں جن و انس کا اکٹھا ذکر فرما رہے ہیں تو کیا سائنس ہماری مقدس کتاب قرآن مجید سے زیادہ افضل ہو گئی ہے؟''

''میرے کہنے کا مطلب تھا کہ......'' ہیبت خان نے بولنا چاہا لیکن محمد حنیف نے اسے ٹوک دیا۔

''آپ کے گھر کے اندر ایک دو نہیں بلکہ درجنوں ارواح کا بسیرہ ہے۔''محمد حنیف نے موضوع بدلا۔

''تو ان سے کیسے جان چھڑوائی جا سکتی ہے؟'' ہیبت خان نے پوچھا۔

''آج رات میں ایک وظیفہ کروں گا۔''محمد حنیف گویا ہوا۔

''آپ لوگ کل صبح مجھے لینے آ جانا ضرور کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

☆......☆......☆

پچھلی رات کا وقت تھا۔ ہر کس و ناکس گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔مونا خان اور ہیبت خان ایک ہی کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے۔ یکدم مونا خان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دائیں پاؤں کی ہتھیلی میں کسی نے زور سے گدگدی کی ہو۔مونا خان جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ایک نگاہ ہیبت خان کو دیکھا لیکن وہ گہری نیند سو رہا تھا۔مونا خان انگشت بدنداں رہ گئی۔تبھی اس کی سماعت سے کسی کے چلنے کی آواز ٹکرائی۔ باہر کوئی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔مونا خان کو تشویش ہوئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ہیبت خان کو اٹھائے لیکن پھر اس کی نیند میں خلل ڈالنا اس نے بہتر نہ سمجھتے ہوئے خود ہی اٹھ کر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔ جلدی سے دروازہ کھول کر وہ باہر راہداری میں نکلی اور ادھر ادھر دیکھا۔

تبھی اس کی نگاہ راہداری کی نکر پر یوٹرن لیتی ایک دوشیزہ پر پڑی۔اس دوشیزہ کی رفتار کافی تیز تھی۔نجانے کیوں اس کے دل کے مندر میں خوف کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی۔ ایک بار پھر اس نے سوچا کہ ہیبت خان کو اٹھائے لیکن پھر اس کے دماغ میں بات آئی کہ ممکن ہے تب تک وہ کہیں روپوش ہو جائے۔نجانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس دوشیزہ کا ضرور اس کے لخت جگر کی موت

سے کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔ دوشیزہ یوٹرن لے کر مڑ چکی تھی۔ضرور وہ حویلی کی کوئی ملازمہ تھی۔مونا خان تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے ہو چلی۔ جیسے ہی اس نے یوٹرن لیا اس نے دوشیزہ کو ملازموں کے کوارٹر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔اب تو اس کا پارہ ہائی ہو گیا۔ایک دو ٹکے کی ملازمہ نے اس نے لخت جگر کو ابدی نیند سلایا تھا۔ضرور یہ لوگ ان کے سب کچھ کو ہڑپ کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔مونا خان نے تہیہ کر لیا کہ اس دوشیزہ کو اپنے ہاتھوں ابدی نیند سلا کر قلبی سکون حاصل کرے گی۔

دوشیزہ ایک کوارٹر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔مونا خان بھی تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے پہنچ گئی اور سرعت سے دروازہ کھول کر کوارٹر میں داخل ہو گئی۔اندر گھپ اندھیرا تھا۔ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے اس کی بینائی ہی چھن گ ءیہو۔جلد ہی اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔وہ اپنے لیے راستے کا تعین کر سکتی تھی اور بغور دیکھنے پر دوسرے کی موجودگی کو بھانپ سکتی تھی۔دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھنے لگی۔اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ایک انجانے خوف نے پوری طرح سے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔راہداری سے گزر کر وہ صحن میں داخل ہو گئی۔تاریک رات ہونے کی وجہ سے چہار سو گھپ اندھیرے کی گہری چادر تنی ہوئی تھی۔لیکن اب وہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھی۔

عورت ذات کو اللہ تعالٰی نے عجیب سانچے میں ڈھالا ہے۔دل کی کمزور مگر ارادوں کی پختہ۔یقین کامل اور ہمت نا پختہ۔لیکن جب کسی بات پر ڈٹ جائے تو اس کے ارادوں میں پہاڑوں کی سی پختگی اور مردانہ حوصلہ عود کر آتا ہے۔مردوں کو پچھاڑ دیتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر عورت کی بہادری کے پیچھے بالکل اسی طرح کسی مرد کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے جیسے کسی کامیاب مرد کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

مونا خان کے سامنے دو کمرے تھے۔دونوں کے دروازے بند تھے۔صاف ظاہر تھا کہ ان میں سے ایک کے اندر اس کا دشمن چھپا ہوا تھا لیکن فی الوقت اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس کمرے میں ہو گا؟ دائیں طرف والے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر وہ کان لگا کر سنتی رہی لیکن اندر سے کوئی آواز پیدا ہوتی تو اسے سنائی دیتی لیکن جیسے ہی وہ دوسرے دروازے کے پاس پہنچی اسے فوراً اندر سے کسی کی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔غراہٹ ایسی تھی جیسے کوئی درندہ غرا رہا ہو۔مونا خان غراہٹ کی آواز سن کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔مونا خان نے سوچا کہ ممکن ہے دشمن کو پتہ چل گیا ہو کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور اب وہ ڈرانے کی غرض سے جانوروں کی سی آوازیں نکال رہا ہو۔

اس خیال کے آتے ہی مونا خان نے بنا کچھ سوچے سمجھے کمرے کا دروازہ کھٹاک سے کھول دیا۔دروازہ کھلتے ساتھ ہی غراہٹ کی آواز آنا یک لخت بند ہو گئی۔مونا خان تھوڑی دیر کھڑی دیکھتی رہی لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔بالآخر تمام تر ہمت یکجا کر کے وہ اندر داخل ہوئی۔کمرے کے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی اس کے نتھنوں سے بدبو کے بھبھوکے ٹکرائے۔تبھی اس کو یوں لگا جیسے اس

کے علاوہ بھی کوئی کمرے میں موجود ہو لیکن وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تت ......تم کون ہو؟'' مونا خان نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''جو کوئی بھی ہو سامنے آؤ۔''

جواباً ایک بار پھر غراہٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ مونا خان نے آواز کی سمت دیکھا تو اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اس کے سامنے ایک درندہ کھڑا تھا۔ جو خونخوار آنکھوں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی شکل کسی کتے کی مانند تھی لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔ اس کے پورے جسم پر کالے کالے لمبے بال تھے۔ وہ مسلسل غرا رہا تھا۔ اس کی زبان بار بار منہ سے باہر نکل رہی تھی۔ اور اس سے رال ٹپک رہی تھی۔ بے شک کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ باوجود اس کے کہ مونا خان کو سب کچھ مترشح (واضح) دکھائی دے رہا تھا۔

مونا خان خوف کی شدت کے باعث بری طرح سے کانپ رہی تھی۔ اس کی ساری بہادری نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے تھرتھراتے قدموں سے وہ واپس پلٹنے لگی۔ جیسے جیسے وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ویسے ویسے اس درندے کی غراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مونا خان نے کمرے سے باہر نکل کر دوڑنا چاہا لیکن اگلا منظر دیکھا کر حیران رہ گئی۔ ہر طرف اس درندے جیسے بے شمار درندے اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ پوری طرح سے گھر چکی تھی۔ درندوں نے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو مونا خان نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ مونا خان پیہم ہیبت خان کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

ہیبت خان جو خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مونا خان کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانے کی دیر تھی کہ وہ فوراً سے بھی پہلے اٹھ بیٹھا۔ مونا خان کی آواز پیہم اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔ ہیبت خان کے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے وہ دوڑتا ہوا بیڈ سے اترا اور دروازے تک گیا پھر انہی قدموں پیچھے پلٹا اور رائفل اٹھا کر باہر نکلا۔ تب تک ملازموں کی بھی دوڑیں لگ چکی تھیں۔

ہیبت خان پیہم دوڑتا ہوا راہداری کراس کر کے ملازموں کے کوارٹروں کی طرف بڑھا۔ گھر کے ملازم بھی اکٹھے ہو چکے تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ اندر جاتا لیکن ہیبت خان دوڑتا ہوا سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سارے ملازم بھی پیچھے دوڑے۔

دوسری طرف مونا خان کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ وہ بری طرح سے پھنس چکی تھیں۔ درندے اسے چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ کمرے میں موجود درندہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ڈر کے مارے مونا خان کے منہ سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ یکدم درندے نے اپنا منہ کھولا تو یوں لگا جیسے وہ منہ نہ ہو بلکہ کسی غار کا دہانہ ہو جو کھلتا ہی جا رہا تھا۔ بدبو کے بھبھوکوں نے مونا خان کے نتھنوں پر دستک دی تو مونا خان کو یوں لگا جیسے اسے ابھی کے ابھی الٹی آ جائے گی۔ بدبو جب حد تک زیادہ بڑھ گئی تو مونا خان نے سانس روکی لیکن کب تک......؟

مونا خان نے جب اس درندے کا بڑا سا منہ کھلتے دیکھا تو خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور اسی لمحے وہ ہو گیا جس کا کسی کو یقین

بھی نہیں تھا۔اس درندے نے اپنا بڑا سا منہ آگے بڑھا کر منہ خان کا چہرہ گردن تک اپنا منہ میں چھپالیا اور یکدم اتنی زور سے اپنا منہ بند کیا کہ مونا خان کا سر تن سے جدا ہو گیا۔مونا خان کی آخری چیخیں تک دب گئیں۔

عین اس وقت جب ہیبت خان اندر داخل ہوا اس نے ایک نا قابل یقین منظر دیکھا۔اس درندے نے مونا خان کا سر تن سے جدا کر کے مزے لے لے کر چبانا شروع کر دیا۔مونا خان کی گردن سے لہو کسی فوارے کی مانند نکلا۔دوسرے ہی لمحے مونا خان کا جسد خاکی دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ ہیبت خان یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ایک ساتھ کتنی ہی عفریتیں پورے صحن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ہیبت خان کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے اتھرو نکل کر زمین پر جا گرے۔دوسرے ہی لمحے ہیبت خان نے اس درندے کا نشانہ لیا جس نے مونا خان کو ابدی نیند سلایا تھا۔ٹریگر دباتے ہی کارتوس نکل کر درندے سے ٹکرایا تو ایک ساتھ سارے درندے یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

رائفل ہیبت خان کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر جا گری۔ ہیبت خان تھکے ماندے قدموں سے اشک بہاتا مونا خان کی طرف بڑھا۔تب تک ہیبت خان کے دونوں بیٹے بھی پہنچ چکے تھے۔ماں کے تڑپتے وجود کو انہوں نے بھی دیکھ لیا تھا۔دونوں دھواں دھار روتے ماں کے جسد خاکی کی طرف بڑھے۔ ہیبت خان سے پہلے منشی فیض رسول نے آگے بڑھ کر مونا خان کے ٹھنڈے پڑ جانے والے وجود پر اپنی چادر اتار کر ڈال دی۔ ہیبت خان کو اس نے گلے سے لگالیا۔ ہیبت خان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔منشی فیض رسول نے اشارہ کیا تو ملازم فوراً چارپائی لے آئے۔مونا خان کے وجود کو چارپائی پر ڈال دیا گیا۔

مونا خان کا وجود غسل کے قابل نہیں تھا۔منشی فیض رسول کے کہنے پر ملازم مولوی صاحب کو بلا لائے تھے۔حالات وواقعات سے آگہی کے بعد مولوی صاحب نے فوراً جنازہ پڑھانے کی تاکید کی اور ساتھ میں قبر کی کھدائی شروع ہو گئی۔مونا خان کو درجنوں سوگواروں کی موجودگی میں فوراً سے بھی پیشتر سپرد خاک کر دیا گیا۔ ہیبت خان اور اس کی اولاد کی حالت دیدنی تھی۔دونوں بیٹے بری طرح سے ڈرے سہمے ہوئے تھے اور باپ سے لپٹے ہوئے۔کتنی دیر تک ہیبت خان قبر کے پاس بیٹھ کر روتا رہا۔شاید اسے مونا خان کی موت کا یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔مولوی صاحب کو سختی سے تاکید کی گئی کہ حالات وواقعات کے بارے میں گاؤں میں یا کہیں بھی کسی کو پتہ نہ چلے۔مولوی صاحب وعدہ کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

منشی فیض رسول نے ہیبت خان کو سہارہ دے کر اٹھایا اور ٹی وی لاؤنج میں لے جا کر صوفے پر بٹھا دیا۔راشد خان اور حیدر خان دونوں باپ کے ساتھ سائے کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

''سب کچھ ختم ہو گیا۔'' ہیبت خان نے روتے ہوئے منشی کو مخاطب کیا۔

''میں آپ کا درد سمجھ سکتا ہوں سرکار۔'' منشی نے نم آلود لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں منشی۔'' ہیبت خان گویا ہوا: ''جو مجھ پہ بیت رہی ہے۔وہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

منشی ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ہیبت خان نے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ چپکالیا۔ ''میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے اب مجھے اپنی جان بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔''

ہیبت خان کی بات سن کر منشی فیض رسول نے پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

''سرکار پانی پی لیجیے آپ کا حلق خشک ہو چکا ہے۔'' منشی فیض رسول بولا۔

''اب اس وقت تک مجھ پر کچھ بھی کھانا پینا حرام ہے منشی جب تک میں اپنے فرزند اور اہلیہ کے قاتل کو ابدی نیند نہ سلا لوں۔'' ہیبت خان گلا پھاڑ کر بولا تو منشی فیض رسول نے فوراً گلاس نیچے میز پر رکھ دیا۔

''ہم علی الصبح محمد حنیف کے ہاں جائیں گے سرکار۔'' منشی فیض رسول تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''علی الصبح نہیں۔'' ہیبت خان بولتے ہوئے رکا اور ایک دردبھری سانس خارج کی پھر گویا ہوا: ''ہم لوگ ابھی جائیں گے۔''

''کیا ان کی نیند میں خلل نہیں ہو گا؟'' منشی فیض رسول نے پوچھا۔

''میری دنیا اجڑ چکی ہے اور اگر اس شخص کی نیند میں خلل پیدا ہو جائے تو کوئی حرج ہے؟'' ہیبت خان صوفے سے اٹھتے ہوئے غصے سے پیچ و تاب کھا کر بولا۔

''دیکھ رہے ہو ان بچوں کی طرف (بچوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) کیا ان کے اندر جھانک کر تم دیکھ سکتے ہو......؟ تم جانتے ہوئے ہم لوگوں پر کیا گزر رہی ہوگی......؟ کبھی تم نے کسی اپنے کو کندھا دیا ہے......؟ لیکن تو گواہ ہے کہ میں نے اپنے فرزند اور اہلیہ کو کندھا دیا ہے۔ میرا دل کٹ کر ٹکڑوں میں منقسم ہو چکا ہے۔ اگر میرے ساتھ یہ دو بچے نہ ہوتے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا دیا بجھا دیتا......اور تم......تم کہتے ہو کہ اس شخص کی نیند میں خلل نہ پیدا ہو جائے۔''

آنسو ہر بند توڑ کر جاری و ساری تھے۔ ہیبت خان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اس کی ہر ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ زمین کی عمیق گہرائیوں اور آسمان کی وسعتوں سے بھی اپنی اہلیہ اور فرزند کے قاتلوں کو ڈھونڈ کر سپرد خاک کر دیتا۔ منشی فیض رسول کی بات پر وہ تیخ پا ہو گیا تھا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر منشی فیض رسول کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھا اور گویا ہوا:

''میں آپ کی عزت اپنے والد کی طرح کرتا ہوں۔''

''میں اس عزت افزائی کا بہت مشکور ہوں سرکار۔'' منشی فیض رسول سر جھکا کر بولا۔

''میں کیسے آپ کو سینہ چیر کے دکھاؤں کہ میرا دل جل بھن کر رہ گیا ہے۔'' ہیبت خان ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے میرے جینے کا ہر حق چھین لیا گیا ہے۔ ایسے میں اگر وہ شخص مزے کی نیند سو رہا ہے۔ تو آپ بتائیے

کیا وہ ٹھیک ہے ۔کیا ایسے انسان پر ہم مزید اعتماد کر سکتے ہیں ۔نہیں ناں ......پھر ہمیں دوبارہ پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہوگی ۔ہم کسی نہ کسی سے ضرور ملیں گے ۔میں آج ہی ان عفریتوں کو ختم کروں گا۔بہرصورت ۔''

ہیبت خان کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں ۔منشی فیض رسول نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ہیبت خان کی آنکھوں سے جاری اشک صاف کیے۔

''سرکار آپ کی حالت دیکھ کر آپ کے صاحبزادوں کی حالت مزید ابتر ہو سکتی ہے ۔''منشی فیض رسول نے یاددلایا تو ہیبت خان نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پایا اور پیچھے ہٹ کر دونوں بیٹوں کو گلے لگالیا ۔

''میرے بچوں ۔'' ہیبت خان ہونٹ بھینچتے ہوئے اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا ۔

''تم چنتا مت کرو ۔دیکھنا وقت دور نہیں ۔تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے بھائی اور ماں کے قاتل آگ میں سڑیں گے ۔اگر ان کو عبرت ناک موت نہ ملی تو مجھے بھی تاحیات سکون میسر نہیں ہوگا ......میں تم دونوں کی اندرونی کیفیت سے آشنا ہوں کیونکہ میری حالت بھی تم دونوں جیسی ہی ہے لیکن ......لیکن اب ہمیں فولاد کی طرح مضبوط ہونا پڑے گا کیونکہ اب سر پر کفن باندھنے کا وقت آچکا ہے ۔''

''ابو میں ماروں گا سب کو ۔''راشد خان دائیں ہاتھ کے کف سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا ۔

''نہیں میں ۔''اس کے بولتے ساتھ ہی فوراً حیدر خان بول اٹھا ۔

''شاباش میرے شہزادوں ۔'' ہیبت خان نے دونوں کو سینے سے چپکاتے ہوئے کہا ۔

''آج فخر سے میرا سر بلند ہوگیا ہے ۔تم دونوں نے ثابت کردیا ہے کہ تم ہیبت خان کے فرزند اور وجاہت خان کے پوتے ہو ۔شیروں کے بچے ہمیشہ شیر ہی ہوتے ہیں ۔شیر کی کھال اوڑھ لینے سے کبھی گیدڑ کی اولاد شیر نہیں بنتی ۔پس پشت وار کرنے والا درحقیقت قاہر ہوتا ہے ۔اس کے اندر اتنی سکت نہیں ہوتی کہ کھل کر مقابلہ کر سکے لیکن وہ جو کوئی بھی ہے ہم سب مل کر اس کا خاتمہ کریں گے ۔چلو ہمیں ایک کام جانا ہے ۔اس کے بعد اگلا لائحہ عمل مرتب کریں گے ۔''

ہیبت خان اٹھ کھڑا ہوا ۔دونوں بچوں نے اشک صاف کیے ۔منشی فیض رسول معصوم بچوں کے ٹھوس ارادے دیکھ کر گنگ رہ گیا ۔

''میرے بچے شیر ہیں ۔'' ہیبت خان فخر سے سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا ۔

''ہم لوگ پٹھان ہیں اور پٹھان کبھی حالات کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتے ۔عزت اور غیرت کے نام پر ہم لوگ جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتے ۔ہم لوگ کسی کا برا نہیں سوچتے لیکن جب کوئی ہماری طرف انگلی کرتا ہے تو ہم اس کا ہاتھ ہی کاٹ دیتے ہیں اور جب کوئی میلی آنکھ سے دیکھتا ہے تو اس کی سر تن سے جدا کر دیتے ہیں ۔

مجھے فخر ہے کہ میرے بچے چٹانوں کے سے مضبوط ارادوں اور ہمت وحوصلے والے ہیں ۔تم دیکھنا منشی کہ اگر مد مقابل کوناکوں

چنے نہ چبانے پر مجبور کر دیا تو میرا نام بھی ہیبت خان نہیں ہے۔''

منشی فیض رسول تصدیق میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیبت خان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ہمت مرداں، مدد خدا۔ جب بھی انسان اپنے اللہ تعالیٰ پر مکمل یقین رکھ کے کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہی تو انسان کو اس کی اصل پہچان کرواتا ہے۔ لفظ اشرف المخلوقات سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن اس لفظ کی حقیقت سے قسمت والے ہی آشنا ہو سکتے ہیں۔ تبھی تو ڈاکٹر علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

یہ محنت بہت کم لوگ اپنی زندگی میں کرتے ہیں۔ اور جنہوں نے بھی محنت کی اللہ تعالیٰ نے ان کے نام ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیئے۔ کسی کو خواجہ معین الدین بنا دیا تو کسی کو داتا علی ہجویری، کوئی فرید الدین شکر گنج بنا تو کہیں سے بلھے شاہ کا نام گونج اٹھا۔ ایسے ہی لوگ اپنی حقیقت کو پہچانتے ہیں اور جب پہچانتے ہیں تو قرب الٰہی ان کو نصیب ہوتا ہے اور جسے قرب الٰہی نصیب ہو جائے اس کے اندر سے حق کی گونج اٹھتی ہے۔ پھر چاہے کربلا کے شہیدوں کی طرح نسلیں کیوں نہ قربان کرنی پڑ جائیں وہ طابل کے سامنے لبیک نہیں کہتے کیونکہ جنہوں نے خود کو پہچان لیا انہوں نے خدا کو پہچان لیا اور جنہوں نے خدا کو پہچان لیا انہوں نے حق کو پہچان لیا۔

☆......☆......☆

گاڑی منشی فیض رسول ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب کہ پچھلی سیٹ پر ہیبت خان اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگائے براجمان تھا۔ ابھی وہ محمد حنیف کے گھر سے چند قدم پیچھے تھے کہ منشی فیض رسول نے گاڑی روک دی۔

''کیا ہوا......؟'' ہیبت خان نے پوچھا۔ ''گاڑی کیوں روک دی ہے؟''

''سامنے سے محمد حنیف صاحب آ رہے ہیں۔'' منشی فیض رسول نے بتایا۔

''کیا......؟'' ہیبت خان بے یقینی کے عالم میں بولا اور جب سامنے والے شیشے سے باہر جھانکا تو گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں اسے محمد حنیف سرعت سے ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

ہیبت خان دونوں بچوں سمیت گاڑی سے اتر گیا۔ منشی فیض رسول بھی گاڑی سے اتر آیا۔ اتنی دیر میں محمد حنیف ان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

''لگتا ہے آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' منشی فیض رسول نے محمد حنیف کے قریب پہنچنے پر پوچھا۔

''جی نہیں۔'' محمد حنیف نے جواب دیا۔ ''میں آپ لوگوں کا منتظر تھا کیونکہ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ آپ لوگ میری طرف آ رہے

ہیں۔''

''لیکن کیسے ......؟'' ہیبت خان نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔''کس نے بتایا ہے آپ کو؟''

''آپ لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ پائیں گے۔'' محمد حنیف بولا۔''میں وہ سب کچھ بھی جانتا ہوں جو آپ لوگوں پر بیت چکی ہے۔تبھی تو میں گھر سے باہر نکل کر تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔''

''مطلب آپ جانتے ہیں کہ......'' ہیبت خان بولنا چاہتا تھا لیکن محمد حنیف نے اسے چپ کروا دیا۔

''سنبھالیے خود کو۔'' محمد حنیف بولا۔''ہر کام میں اوپر والے کی طرف سے بہتری پنہاں ہوتی ہے۔رونے دھونے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کے ہمت و حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں۔آپ لوگوں نے جو قربانیاں دینی تھیں دے لیں۔اب ظالموں کا وقت آ خر آ چکا ہے۔ہمیں فوراً آپ کی حویلی میں چلنا ہے۔''

محمد حنیف کی بات سن کر ہیبت خان نے خود آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔محمد حنیف کے ہاتھ میں ایک کپڑے کا تھیلا تھا۔اسے سنبھالتا ہوا وہ اندر بیٹھ گیا۔اس کے بیٹھتے ساتھ ہی ہیبت خان نے دروازہ بند کیا اور بچوں کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔اتنی دیر میں منشی فیض رسول بھی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔گاڑی کو واپس موڑ کر حویلی کی طرف اس کا رخ کر دیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ حویلی میں پہنچ چکے تھے۔حویلی کے سارے ملازم جاگ رہے تھے۔ان لوگوں کے واپس آتے ساتھ ہی سب اکٹھے ہو گئے۔محمد حنیف نے فوراً سب مکینوں کو بلایا اور سب کو ایک دائرہ کھینچ کر اس میں بٹھایا اور ساتھ ہی سختی سے تاکید کی کہ کوئی بھی دائرے سے باہر نکلا تو اپنی موت کا خود ہی ذمہ دار ہوگا۔پھر ایک دائرہ کھینچ کر اس کے اندر ہیبت خان، اس کے دونوں بچوں اور منشی فیض رسول کو بٹھا دیا۔پھر تیسرا دائرہ کھینچ کر اس کے اندر خود بیٹھ گیا۔تینوں دائرے ایک ساتھ سیدھے کھینچے گئے تھے۔

اپنے دائرے میں بیٹھنے کے بعد محمد حنیف نے تھیلے میں سے مٹی کی ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی اور اسے دائرے سے باہر رکھ دیا۔پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پانی کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس ہانڈی کو لبالب بھر دیا۔پھر اس ہانڈی کے چہار سو ان گنت اگربتیاں لگا ئیں۔ہر سو اگربتیوں کی خوشبو پھیلنے لگی۔محمد حنیف منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ بھی رہا تھا۔محمد حنیف نے ایک بار پھر تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالا اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔پھر محمد حنیف نے تھیلا اپنے سامنے رکھ دیا۔چھڑی کو دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس کا دوسرا سرا ہانڈی کے اندر بھرے پانی میں ڈبو دیا۔سب محمد حنیف کو دیکھ رہے تھے۔

محمد حنیف متواتر منہ ہی منہ میں قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔آہستہ آہستہ اس نے بلند آواز سے تلاوت کلامِ الٰہی کرنا شروع کر دی۔تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فضا میں ایک ساعت شکن چیخ گونجی۔سب کے دل حلق کو آن لگے۔ہیبت خان کے دونوں بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ہیبت خان نے جلدی سے دونوں کو سینے سے چپکا لیا۔عین اسی وقت سب نے دیکھا کہ جس طرف راہداری

ملازموں کے کوارٹروں کی طرف جا رہی تھی ۔اس طرف سے ایک نہایت ہی حسین وجمیل الہڑ مٹیار ن شان بے نیازی سے چلتی ہوئی محمد حنیف کی طرف بڑھنے لگی ۔

محمد حنیف پیہم قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا ۔وہ دوشیزہ آ کر محمد حنیف کے سامنے دوزانوں بیٹھ گئی ۔ ہیبت خان سمیت سب اسے انگشت بدنداں آنکھوں سے گھورنے لگی ۔محمد حنیف نے اپنی تلاوت ختم کی تو اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا ۔

’’کیا نام ہے تمہارا ۔؟‘‘ محمد حنیف نے پوچھا ۔

’’چاندنی ۔‘‘ دوشیزہ نے مختصر سا جواب دیا ۔

’’پورا نام ۔‘‘ محمد حنیف نے دوبارہ پوچھا ۔

’’نندنی ملہوترا لیکن سب پیار سے چاندنی کہتے تھے کیونکہ میں چاند سے بھی زیادہ حسین تھی ۔‘‘

’’اس گھر میں کیوں گھسی ہوئی ہو؟‘‘ محمد حنیف نے پوچھا ۔

’’میں خود نہیں آئی ۔‘‘ چاندنی نے جواب دیا ۔

’’تو ......؟‘‘ محمد حنیف نے اسے گھورا ۔

’’اس کا باپ زبردستی لے کر آیا تھا ۔‘‘ چاندنی نے کھا جانے والی نگاہوں سے ہیبت خان کو گھورتے ہوئے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا ۔

’’تم نے اس کے بیٹے اور اہلیہ کو کیوں مارا ؟‘‘ محمد حنیف نے پوچھا ۔

’’کیوں کہ اس کے باپ نے میرے پورے پریوار کو ابدی نیند سلا دیا تھا ۔‘‘ چاندنی ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی ۔

’’ہماری خوشیوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا اس ظالم نے ۔ برسوں بعد ہمارے گھر میں خوشیوں نے پڑاؤ ڈالا تھا لیکن اس ظالم انسان نے ان خوشیوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا ۔جس طرح اس نے میری فیملی کو بے موت مارا بالکل ویسے ہی میں اس کی ساری فیملی کو اذیتیں دے دے کر ماروں گی ۔‘‘

’’وضاحت دو ۔‘‘ محمد حنیف گویا ہوا تو چاندنی نے کھوئی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں ۔اس کے بعد وہ بولتی گئی اور سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سنتے رہے ۔

☆......☆......☆

’’چاندنی ......ارے او چاندنی ......سن تو ۔‘‘ دیپک نے چاندنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن مجال ہے کہ اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی ۔

چاندنی پیہم چھوٹی سی پگڈنڈی پر تیز تیز ڈگ بھرتی چلتی جا رہی تھی ۔

''دیکھوتو میں تمہارے لیے کیالایاہوں؟''

دیپک نے ایک بار پھر کہا لیکن چاندنی اپنی مستی میں مگن چلتی ہی رہی۔

''ایک خوبصورت سی پائل لایاہوں جوتمہارے خوبصورت پیروں کواور بھی زیادہ خوبصورت کردے گی۔''

پائل کانام سنتے ہی جیسے چاندنی کے پیروں کوزمین نے جکڑلیا ہو۔وہ فوراًمڑی۔

''کیاواقعی تم پائل لائے ہو؟'' چاندنی نے سوالیہ نگاہوں سے دیپک کودیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواباً دیپک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پائل نکال اوراس کی ایک سائیڈ انگلی اورانگوٹھے میں دبا کربقیہ کوہوامیں جھلاتے ہوئے اسے دکھایا۔پائل اتنی خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کرچاندنی دوڑتی ہوئی دیپک کے پاس آرکی اورجلدی سے پائل پکڑنا چاہی لیکن دیپک نے پائل کومٹھی میں بھینچ لیا۔

''میں خود پہناؤں گا۔'' دیپک نے ضد کی۔

''چل پگلے۔'' چاندنی کے لب و لہجے میں شرم وحیا کی جھلک عیاں تھی۔

''میں تمہاراہونے والاپتی ہوں۔'' دیپک نے اسے یاددلایا۔

''لیکن ابھی تک بنے تونہیں۔'' چاندنی نے اسے چھیڑا۔

''بس اب جلدہی بن جاؤں گا۔'' دیپک خوشی سے بولا۔''اب تو میری جاب بھی لگ گئی ہے۔اب میں اتناکمارہاہوں کہ پتاجی کوکبھی کام نہیں کرنے دوں گا۔میں سارے گھرانے کاخرچہ اب خوداٹھاؤں گا۔''

''اب توتم شہری بابوبن گئے ہوہے ناں؟'' چاندنی نے دیپک کےقریب کھڑے ہوکراس کے سینے پردائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہارے لیےوہی پینڈو دیپک ہی ہوں۔'' دیپک بولا اورچاندنی کھلکھلاکرہنس دی۔

''اب پہناؤ بھی۔ترساؤمت۔'' چاندنی نے للچائی ہوئی اکھیوں سے پائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دیپک نے اپنے ہاتھوں سے پائل چاندنی کے بائیں پاؤں میں پہنائی۔چاندنی خوشی سے پھولے نہ ساتے ہوئے پائل کوتکنے لگی تھی۔

''تمہیں پسندآئی کیا؟'' دیپک نے پوچھا۔

''بہت خوبصورت ہے۔'' چاندنی نے جواب دیا۔''بالکل تمہارے جیسی۔''

دیپک زیرلب مسکرادیا۔دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پگڈنڈی پرچلتے ہوئے گھر کی طرف ہولیے۔دونوں نہیں جانتے تھے کہ ان کوکچھ آنکھیں بغوردیکھ رہی تھیں۔

وہ کوئی اورنہیں بلکہ وجاہت خان تھا۔ جو اپنے کارندوں کے ساتھ کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وجاہت خان للچائی ہوئی آنکھوں سے پیہم چاندنی کو گھورے جارہا تھا۔ اس نے گاڑی پگڈنڈی کے سامنے سڑک پر روک دی تاکہ جیسے ہی چاندنی اور دیپک قریب پہنچیں۔ وہ چاندنی کو لائن مار سکے۔ جب چاندنی اور دیپک اپنی موج مستی میں چلتے ہوئے ان کے قریب سے گزرنے لگے تو وجاہت خان سرعت سے گاڑی سے اتر کر ان کے سامنے آ گیا۔

''بہت جلدی میں ہو کیا؟'' وجاہت خان نے پوچھا۔

''راستہ چھوڑو ہمارا۔'' دیپک پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولا۔

''تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟'' وجاہت خان نے مونچھوں کو تائو دیتے ہوئے پوچھا۔ ''چل اپنا راستہ پکڑ ورنہ بھیجہ نکال کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔''

''تم ہوتے کون ہو ہمارا راستہ روکنے والے؟'' دیپک غصے سے بولا۔

''یو ایڈیٹ۔'' وجاہت خان دانت پیستے ہوئے بولا۔

اس کا اشارہ پاتے ساتھ ہی اس کے کارندے دیپک پر پاگل کتے کی طرح ٹوٹ پڑے اور انہوں نے دیپک کو مار مار کر لہولہان کر کے رکھ دیا۔

''جا اور بتا دینا کہ جس میں ہمت ہے آ کر اسے لے جائے۔'' وجاہت دخان متواتر دانت پیستے ہوئے بولا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے چاندنی کو اٹھا کر گاڑی میں یوں پھینکا جیسے کوئی کوڑا کرکٹ گھر سے باہر پھینکتا ہے۔ چاندنی نے گاڑی سے باہر نکلنا چاہا لیکن وجاہت خان اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اسے قابو کر لیا۔ پلک جھپکتے میں وجاہت خان چاندنی کو لے کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

دیپک گرتا پڑتا جب گھر پہنچا تو اس کی حالت زار دیکھ کر سب کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ دیپک سیدھا چاندنی کے گھر گیا تھا۔

''یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' چاندنی کے باپ نے اسے سہارہ دیتے ہوئے پوچھا۔

''میری چنتا مت کرو چاچا۔'' دیپک کراہتے ہوئے بولا۔ ''وہ ظالم تیری بیٹی کو اٹھا لے گیا ہے۔ اسے بچانے کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا ہے۔''

''تو کس کی بات کر رہا ہے دیپک؟'' چاندنی کا باپ پریشان ہو کر بولا۔

''وجاہت خان۔'' دیپک دھیمے سے لہجے میں بولا تو چاندنی کا باپ سہم سا گیا۔

''اے بھگوان۔'' چاندنی کے باپ نے آسمان کی طرف منہ کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔''میری بیٹی کی رکھشا کرنا۔''

اتنا کہہ کر چاندنی کا باپ گھر سے باہر نکلا اور سرعت سے قریبی ہندو گھرانوں سے چند افراد کو ساتھ ملا کر فوراً وجاہت خان کی حویلی کی طرف لپکا۔جس وقت وہ لوگ وجاہت خان کی حویلی کے پاس پہنچے۔اس وقت وجاہت خان چاندنی حویلی کے پیچھے بنے ملازموں کے کوارٹر میں اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کے پھینک کے اپنی حویلی میں آ گیا۔لوگوں کا جم غفیر اس کی حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کارندوں نے ان کا راستہ روکا۔

''کہاں ہے وہ خبیث۔باہر نکلواسے۔''ایک ہندو نوجوان نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تجھے زندگی پیاری نہیں ہے۔''وجاہت خان کے ایک کارندے نے اپنی رائفل کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

حالات کی کشیدگی کو بھانپتے ہوئے چاندنی کا باپ سامنے آ گیا اور اس نے ہاتھ جوڑے۔

''بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔''چاندنی کے باپ کے لہجے میں التجا تھی۔

''کونسی بچی؟''اس کارندے نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اتنے نادان مت بنو۔میں تم لوگوں کی بنتی کرتا ہوں بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔'' چاندنی کا باپ متواتر منت کر رہا تھا۔

اتنی دیر میں وجاہت خان شان بے نیازی سے چلتا ہوا حویلی سے باہر آیا تو سارے ہندوؤں نے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''وجاہت خان نے دور سے ہی کھڑے ہو کر پوچھا تو ملازم اس کی طرف ہمہ تن گوش ہوئے۔

''مالک یہ لوگ عجب ہی واویلا کر رہے ہیں کہ ہماری بچی کو چھوڑ دو۔''ایک کارندے نے وجاہت خان کو جواب دیا۔

''کون کہتا ہے؟''وجاہت خان نے پوچھا تو اسی کارندے نے چاندنی کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے میری طرف بھیجو۔''

وجاہت خان کے حکم پر چاندنی کے باپ کو جانے کی اجازت ملی تو اس کے ساتھ کچھ جوانوں نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کے کارندوں نے ان کا راستہ روک لیا۔

''صرف ایک ہی آدمی ملاقات کر سکتا ہے۔جس کا جی چاہے۔''وجاہت خان کا کارندہ گویا ہوا۔

''تم لوگ رکو میں خود جاتا ہوں۔''چاندنی کے باپ نے سب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دبے قدموں چلتا ہوا وجاہت خان کی طرف بڑھا اور سیدھا جا کر اس کے قدموں میں گر گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ ہم لوگ آپ کے سامنے پلید ہیں۔'' چاندنی کے باپ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر بھی آپ کی منت کرتا ہوں کہ بھگوان کے لیے میری بچی کو چھوڑ دو۔''

''شاید تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو؟'' وجاہت خان نے اسے سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کھڑے ہو جاؤ اور وضاحت سے بتاؤ کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟''

چاندنی کے باپ نے دیپک کی سنائی ہوئی کہانی اس کے گوش گزار کی تو وجاہت خان نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

''کون ہے وہ جس نے مجھ پہ یہ الزام تھوپا ہے کیا اسے میرے سامنے لا سکتے ہو؟'' وجاہت خان نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

''بھگوان کے لیے ہم پہ رحم کیجیے آپ ہی ہمارے مائی باپ ہیں۔'' چاندنی کے باپ نے وجاہت خان کے قدموں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''میری پوری حویلی کی تلاشی لے لیجیے آپ لوگ۔'' وجاہت خان غصے سے تقریباً دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگوں نے سوچ کیسے لیا کہ میں ایسی گھٹیا حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہوں؟''

وجاہت خان کی بات سن کر چاندنی کا باپ کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے بہتے اشک صاف کیے۔

''ہماری بیٹی کو لوٹا دیجیے وگرنہ آپ کی اس جھوٹی شان و شوکت کا جنازہ نکال کر رکھ دیں گے۔'' چاندنی کے باپ نے الٹے قدموں آتے کہا تو وجاہت خان نے کھا جانے والی آنکھوں سے اسے گھورا۔

''تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟'' وجاہت خان نے چاندنی کے باپ کو گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

چاندنی کے باپ کو گریبان سے پکڑنا تھا کہ ہندو مشتعل ہو گئے جس کی وجہ سے فوراً ہی وجاہت خان نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں ہماری بیٹی کو ہمارے سپرد کر دو۔'' چاندنی کے باپ نے وجاہت خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''دھکے دے کر باہر نکال پھینکو ان حرام زادوں کو۔'' وجاہت خان غصے سے دھاڑا۔

دوسرے ہی لمحے وجاہت خان کے کارندوں نے سب کو گن پوائنٹ پر کر کے حویلی سے باہر نکال دیا۔ سارے ہندو آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ دوسری طرف دیپک کو وید سے مرہم پٹی کروا دی گئی تھی۔ ہندو جب واپس پہنچے تو باقی سارے بھی ان کے پاس اکٹھے ہو گئے اور ان کی زبانی ساری بات سن کر مشتعل ہو گئے۔

''وہ بہت کمینہ ہے۔'' چاندنی کا باپ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولا۔

وہ اپنے ضبط پر قابو پانے کی سعی کررہا تھا لیکن پھر بھی اشک اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔

''تو چنتا کائے کو کرتا ہے چاچا۔'' وکرم اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔''چاندنی ہماری عزت ہے۔ہم سب اسے لے کرآئیں گے۔''

چاندنی کا باپ روتا بلکتا اپنے گھر میں گھس گیا جہاں اس کی اہلیہ کو محلے کی عورتیں دلاسہ دے رہی تھیں۔اپنے خصم کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کراس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

وجاہت خان حالات وواقعات سے آشنائی حاصل کر چکا تھا۔وہ جانتا تھا کہ گرم کھانے سے اپنا ہی حلق جلانا تھا۔اس کے ذہن میں فوراًتر کیب آئی اور وہ اس کوارٹر میں گیا جہاں اس نے چاندنی کو مقید کر کے رکھا تھا۔اسے دیکھ کر چاندنی نے کسمسانا شروع کر دیا۔وجاہت خان نے فوراًاس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔منہ پہ بندھا کپڑا بھی کھول دیا۔

''بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔'' چاندنی نے ہاتھ باندھ کرالتجا کرتے ہوئے کہا۔

''ایک شرط پر تمہیں چھوڑوں گا۔'' وجاہت خان تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

جواباًچاندنی منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی سوالیہ نگاہیں پیہم وجاہت خان کے چہرے پر مرتکز ہو گئیں۔

''تم کسی کو بھی نہیں بتاؤ گی کہ تمہیں میں اغواء کر کے لایا تھا۔'' وجاہت خان بولا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' چاندنی فوراًسے بھی پہلے بولی۔

''میں تمہارا کیسے یقین کرلوں؟'' وجاہت خان نے پوچھا۔

''میرے لیے اس سے بڑھ کراور کیابات ہوسکتی ہے کہ میری عزت محفوظ رہ جائے۔'' چاندنی بولی۔''اپنی عزت بچانے کی خاطر ایک لڑکی ایک تو کیا ہزاروں جھوٹ بول سکتی ہے پھر یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تمہارے ساتھ جولڑکا تھا۔اس نے میرا نام لے لیا ہے۔'' وجاہت خان دھیمے لہجے میں بولا۔

''اس کی چنتا مت کیجئے۔'' چاندنی نے یقین دہانی کروائی۔

''لیکن اگر ایسا ہوا تو دوبارہ مجھ سے اچھے کی کوئی امید نہ رکھنا۔'' وجاہت خان چاندنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''میرا وشواس کیجئے۔'' چاندنی بولی۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وجاہت خان بولا اوراٹھ کھڑا ہوا۔

چاندنی ڈرتی ہوئی اس کے پیچھے اٹھ کر چلنے لگی۔وجاہت خان اسے لیے اپنی گاڑی میں آ گیا اور پھر گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا چاندنی کے علاقے میں پہنچ گیا۔اس نے اپنے ساتھ کسی بھی کارندے کولانا مناسب نہ سمجھا۔پورے راستے وہ چاندنی

سے بار بار معافیاں مانگتا آیا۔ چاندنی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ ایک ظالم اور جابر انسان ایسے یکدم کیسے نرم دل بن سکتا ہے۔

چاندنی کے محلے میں گاڑی کیا داخل ہوئی۔ سارے ہندوؤں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ سارے ہندو چاندنی کے گھر کے سامنے مجتمع تھے۔ وجاہت خان کی گاڑی میں چاندنی کو دیکھ کر گنگ رہ گئے۔ دیپک بھی وہیں پر موجود تھا۔ چاندنی گاڑی سے باہر نکلی تو ہندوؤں نے کھا جانے والی آنکھوں سے وجاہت خان کو دیکھا اور پھر ہندوؤں کے پنڈت نے آگے بڑھ کر چاندنی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹا تو کہاں گئی تھی؟'' پنڈت نے پوچھا تو سب چاندنی کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''مجھے چند غنڈوں نے اغواء کر لیا تھا۔'' چاندنی نے بتایا۔

''یہ تو بھلا ہو انسان کا بہت بھلے مانس ہیں۔ انہوں نے میری نہ صرف عزت بچائی بلکہ میری جان بھی بچائی۔ یہ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ اگر آج یہ نہ ہوتے تو غنڈے میری عزت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیتے۔''

چاندنی روتے ہوئے پاس کھڑے اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی۔ چاندنی کے باپ نے حیرت و یاس کے عالم میں وجاہت خان کی طرف دیکھا۔ سارے ہندو بھی حیرت و پریشانی کے عالم میں کبھی چاندنی تو کبھی وجاہت خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دوسری طرف چاندنی کے الفاظ سن کر وجاہت خان کا سینہ چوڑا ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ چاندنی واقعی اس کے حق میں گواہی دے گی۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے کاکا۔'' دیپک نے چاندنی کی بات سن کر چلاتے ہوئے کہا۔

''اسی خبیث انسان نے نہ صرف چاندنی کو اغواء کیا تھا بلکہ مجھے بھی زدوکوب کروایا (چاندنی کو مخاطب کرتے ہوئے) تم اس کی طرفداری کیوں کر رہی ہو تمہارے سامنے اس نے میرا برا حال کروایا تھا اور اسی نے تمہیں اغواء کروایا تھا۔ اس خبیث انسان کو زندہ جلا دو؟''

دیپک کی بات سن کر چاندنی آگے بڑھی اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک زوردار تھپڑ دیپک کے منہ پر رسید کیا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے۔'' چاندنی دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''ایک مہان انسان کی تم اس طرح بے عزتی کر رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی چوٹ تمہارے دماغ پر بھی لگی ہے جس کی وجہ سے تمہیں انسان کی پہچان نہیں ہو رہی۔ یہ میرے محسن اور بھلے مانس انسان ہیں۔''

''چاندنی۔'' دیپک اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں گویا ہوا۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا ......؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ......''

''جسٹ شٹ اپ۔'' چاندنی نے دیپک کا جملہ پورا بھی نہ ہونے دیا۔

دیپک بنا کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ چاندنی کا دل کرچیاں کرچیاں ہوکر رہ گیا تھا۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ وہ سب کو چلا چلا کر وجاہت خان کی حقیقت بتا دے لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اگلی بار اس کی عزت کے ساتھ ساتھ اس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی جان بھی جاسکتی ہے۔وہ جانتی تھی کہ وجاہت خان کتنا خطرناک آدمی ہے۔انسان کے روپ میں وہ ایک بھیڑیا ہے۔

وجاہت خان چپ چاپ گاڑی میں بیٹھا اور واپس چل دیا۔چاندنی کا باپ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اسے موقع ہی نہ مل سکا......جان بچی سو لاکھوں پائے ......انہیں ان کی بچی مل چکی تھی۔خوشی کے مارے وہ پھولے نہ سمارہے تھے۔

☆......☆......☆

''اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟''رانا الفت نے پوچھا۔

جواباً وجاہت خان نے شروع تا آخر ساری روداد اسے کہہ سنائی۔

''تو اب کیا چاہتے ہو؟''

رانا الفت نے پوچھا تو وجاہت خان نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔''اس لونڈیا کو اس کے یار سمیت ایسا مزہ چکھانا چاہتا ہوں کہ ان کی عقل ٹھکانے لگ جائے۔''وجاہت خان بولا۔

''تو پھر تو پریشان کیوں ہے؟''رانا الفت نے پوچھا۔''ویسے ایک بات مجھے پریشان کررہی ہے کہ تیرے پاس ہر چیز تھی۔شان وشوکت بھی اور تیرے تو ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔پھر اس لونڈیا کو تو نے چھوڑ کیوں دیا؟''

''جلد بازی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔''وجاہت خان شیطان مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولا۔

''ممکن ہے ہندو کوئی واویلا مچاتے اور حالات مزید دگرگوں ہوتے۔ایسی صورت میں ہمارا بھانڈہ بھی تو پھوٹ سکتا ہے۔میں نے ایسا تیر پھینکا ہے کہ ہندو میری طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں۔اب اگر میں کچھ کروں گا بھی تو وہ مجھ پر شک کرنے سے پہلے ہزار بار سوچیں گے۔''

''کافی عقل مند ہے تو۔''رانا الفت نے تعریف کی۔''اب آگے کیا کرے گا؟''

''لاشوں کے انبار لگادوں گا۔''وجاہت خان ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولا۔

''لیکن......''رانا الفت نے بولنا چاہا لیکن وجاہت خان نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کروا دیا۔

''کوئی ایسی بات نہ منہ سے نکالنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔بس تو دیکھتا جا کہ ہوتا کیا ہے؟''

رانا الفت نے وجاہت خان کی بات سن کر بس سر ہلا دیا۔وہ جانتا تھا کہ وجاہت خان کس حد تک جاسکتا ہے۔؟

☆......☆......☆

''بابو......ارے او بابو۔'' چاندنی نے دیپک کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دیپک کا باپ اس وقت جانوروں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ چاندنی کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو سوالیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

''دیپک کہاں ہے؟''

چاندنی نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ ''یہیں کہیں ہوگا؟'' دیپک کے باپ نے جواب دیا۔

''مگر یہاں تو کہیں نہیں ہے؟'' چاندنی نے بتایا۔

''ابھی تو یہیں تھا۔'' دیپک کے باپ نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کسی دوست کے ہاں گیا ہو یا پھر یہیں کہیں ہوگا۔''

چاندنی کندھے اچکاتی ہوئی واپس پلٹی۔ پہلے اس نے سوچا کہ گھر چلی جائے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ قریبی باغیچے میں جا کر پتہ کرلے ممکن ہے دیپک وہاں ہو کیونکہ اکثر وبیشتر وہ وہاں ہی ملتا تھا۔ یہ سوچ کر چاندنی باغیچے کی طرف چل دی۔ دیپک کو آوازیں دیتی چاندنی نے ابھی چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ یکدم کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا اور اس کے منہ پر کپڑا رکھ دیا۔ چاندنی اس افتاد کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے لیکن جلد ہی اس کا جسم ڈھلک گیا۔

☆......☆......☆

چاندنی کی آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اجنبی جگہ پر پایا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ وہ باغیچے میں دیپک کی تلاش میں گئی تھی اور کسی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ فٹ سے اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ اس کے ایک طرف زخموں سے چور دیپک پڑا تھا۔ جس کے زخموں سے لہو ابھی تک رس رہا تھا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر چاندنی کا دل مٹھی میں بھر آیا تھا جبکہ دوسری طرف وجاہت خان اور اس کے ساتھ ایک نئی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہی کہتا ہے وجاہت خان۔'' رانا الفت کی آواز سکوت زدہ فضا میں گونجی۔ ''ان ہندوؤں نے کیا اپسرا چھپا کے رکھی ہوئی تھی۔ جانتا ہے تو کہ یہ تو ہیرے جواہرات کے عوض جائے گی۔''

''تم؟'' وجاہت خان کے بولنے سے قبل چاندنی حیرت سے بولی۔

''ارے یہ تو تمہیں جانتی بھی ہے۔'' رانا الفت نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''ہماری بڑی پرانی جان پہچان ہے رانا۔'' وجاہت خان نے کھا جانے والی آنکھوں سے چاندنی کو دیکھتے ہوئے رانا الفت کو بتایا۔

''میں نے کہا تھا ناں......'' دیپک کی کانپتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی تو چاندنی سمیت وجاہت خان اور رانا الفت بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کہ یہ بہت خبیث انسان ہے......لیکن......لیکن تم نے اس کی......حمایت کی تھی۔''

''ارے یہ پگلی ہے۔'' چاندنی کی جگہ وجاہت خان قہقہ مار کے ہنستے ہوئے بولا۔

''یہی بات تو اسے معلوم نہیں تھی۔ یہ کونسی بھلا تیرے جیسی دور اندیش تھی۔ بس اس نے مجھ پہ اندھا دھند اعتماد کرلیا لیکن یہ جانتی نہیں تھی کہ میری دشمنی سانپ کے زہر سے زیادہ خطرناک ہے۔''

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی حرام زادے۔'' چاندنی غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر وجاہت خان کی طرف دوڑی۔

وجاہت خان اور رانا الفت دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوگئے۔ صنف نازک میں کہاں اتنا دم کہ ایک مرد سے مقابلہ کرسکے۔ پھر یہاں تو ایک نہیں دو مرد تھے اور ان دونوں نے مل کر چاندنی کی عزت کی دھجیاں اڑادیں۔ دیپک بھی کچھ نہ کرسکا۔ چاندنی عزت کا جنازہ نکل جانے پر دھواں دھار رو رہی تھی۔ تبھی اس کی نگاہ ایک سلاخ پر پڑی جو دروازے کے ایک جانب پڑی تھی۔

وجاہت خان اور رانا الفت ان دونوں کو اندر قید کرکے جاچکے تھے۔ چاندنی نے فوراً لوہے کی اس سلاخ کو ہاتھ میں پکڑلیا۔ دیپک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر حد سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی محبوبہ کی عزت لوٹ لی گئی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ کرپایا تھا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے کی سکوت زدہ فضا میں چاندنی کی دلخراش چیخ گونجی۔ اگلا منظر دیکھ کر دیپک کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔

☆......☆......☆

چاندنی اور دیپک دونوں نے بند کوٹھڑی کے اندر جان دے دی۔ وجاہت خان اور رانا الفت کو جب اس بات کا علم ہوا تو ان کے حواس باختہ رہ گئے۔ بالآخر دونوں نے دگرگوں حالات سے بچنے کے لیے ان دونوں کو اس بند کوٹھڑی کے اندر گڑھا کھدوا کر دبوادیا۔ یوں چاندنی اور دیپک کا راز ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دفن ہوگیا۔

چاندنی اور دیپک کے گھر والوں نے ان دونوں کو بہت تلاش کیا لیکن انہیں نہ ملنا تھا نہ ملے۔ کئی ہندوؤں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ وجاہت خان پر زور دے کر پوچھیں لیکن انہوں نے انکار کردیا کہ پہلے ایک بار بھی اس پر الزام لگا کر ان سے بہت بڑی بھول ہوچکی ہے اور ایسا اب کبھی نہیں ہوگا۔

دوسری طرف ایک رات وجاہت خان اپنے کمرے میں سویا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے علاوہ بھی کوئی کمرے کے اندر موجود ہے۔ جب اس نے لائٹ جلائی تو کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے پھر لائٹ آف کردی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے من میں عجیب سی بے چینی اور اضطرابیت پیدا ہوچکی تھی۔ وہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ تبھی اس کی

نگاہ یکدم بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر پڑی اور اگلا منظر دیکھا اس کا اوپر سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے اٹک کر رہ گیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے صوفے پر دیپک اور چاندنی براجمان تھے۔دونوں خون میں بالکل ویسے ہی لت پت تھے۔جیسی حالت میں انہیں گڑھے میں دبایا گیا تھا۔

دوسرے دن صبح بار بار کھٹکانے پر بھی جب وجاہت خان نے دروازہ نہ کھولا تو اس کا دروازہ توڑا گیا لیکن اگلا منظر دیکھ کر سب کی حیرت ہویدا رہ گئی۔وجاہت خان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔اس کا وجود ٹھنڈا پڑ چکا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا خوف دکھائی دے رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے خوف کی شدت کے باعث کی اس کی موت ہوئی ہو۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ وجاہت خان کی موت کی وجہ کیا ہے؟بس جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہی کہا اور انہی الفاظ کے ساتھ اسے بھی منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

سب کی نگاہیں اس مہ جبیں پر مرکوز تھیں۔ساری روداد سنانے کے بعد وہ چپ کر گئی۔

''تم دونوں نے اپنا وجاہت خان سے انتقام لے لیا تھا۔''محمد حنیف بولا۔''تو اب ان بے قصور لوگوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہوئی ہو۔''

''کوئی بھی بے قصور نہیں ہے۔''دوشیزہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''کیا میرے والدین بے قصور نہیں ہیں۔جو جیتے جی مر چکے ہیں۔دیپک کے والدین کا بھی یہی حال ہے۔ہم نے وعدہ کیا تھا کہ وجاہت خان کی پوری نسل کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔''

''اب تم ایسا نہیں کر سکتے۔''محمد حنیف نے ہانڈی کے اندر ڈبوئی ہوئی چھڑی کو اٹھایا اور اس پر لگے پانی کو اس دوشیزہ پر چھڑک دیا۔

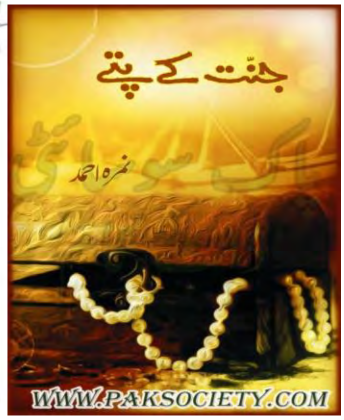
دوشیزہ کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔پھر وہ یوں غرائی جیسے کوئی درندہ غرا رہا ہو۔تبھی راہداری میں سب نے ایک لڑکے کو آتا دیکھا۔وہ لڑکا بھی سیدھا آ کر دوشیزہ کے ساتھ براجمان ہو گیا۔

''میں آخری بار تم دونوں کو متنبہ کر رہا ہوں لیکن اگر اب کی بار تم لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں تمہارا برا حال کر کے رکھ دوں گا۔''محمد حنیف نے دوبارہ چھڑی کو ہانڈی میں ڈبوتے ہوئے کہا۔

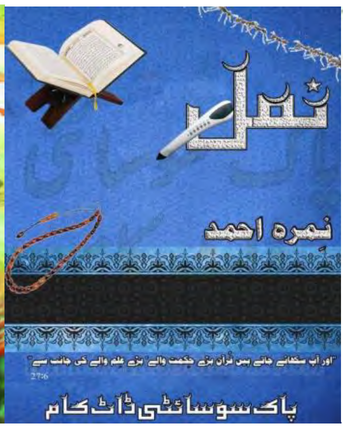
''تم ہمیں انتقام لینے سے نہیں روک سکتے۔''اب کی بار دیپک نے گرجتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے محمد حنیف نے پلک جھپکتے میں چھڑی کو ہانڈی سے باہر نکال کر زمین پر مارا تو یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہوں۔اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر اس نے ہانڈی کا پانی ان دونوں پر پھینک دیا۔ایک لمحے کے لیے دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

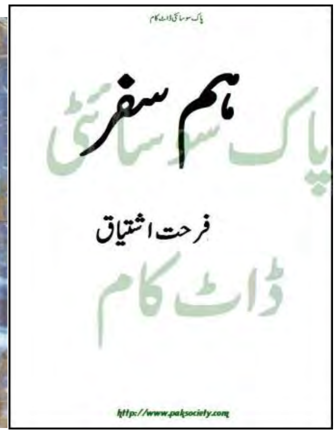
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

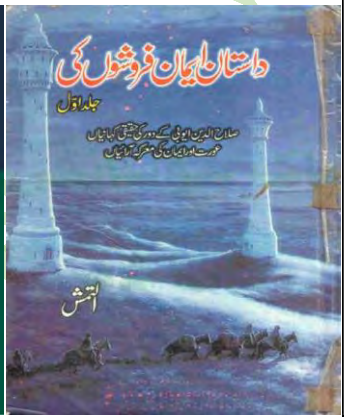




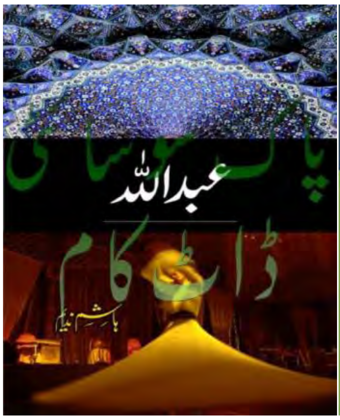


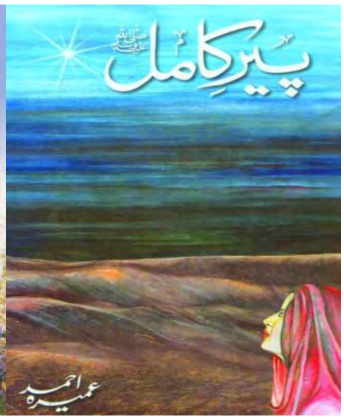




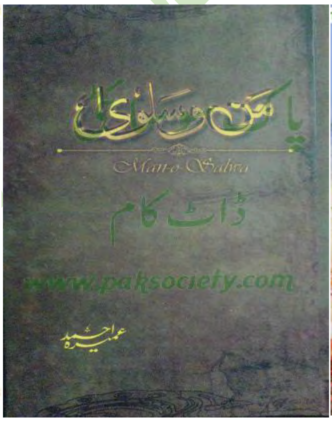




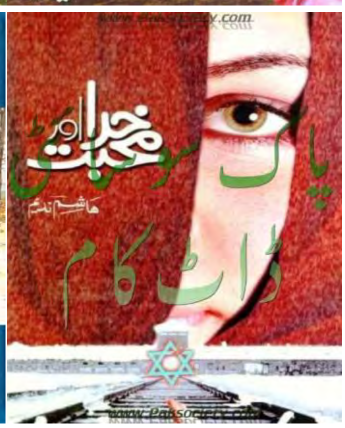


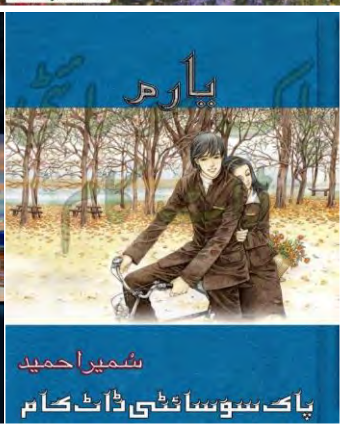




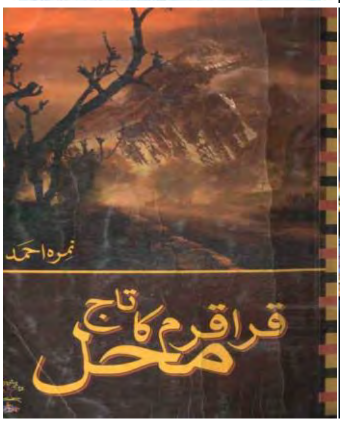












''اتنا بڑا دھوکہ۔'' دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

دوسرے ہی لمحے دونوں کے جسم دھویں میں تحلیل ہو گئے اور پھر سب نے اس دھوئیں کو آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھا۔

محمد حنیف نے سب کو دائرے سے باہر نکل آنے کا حکم دیا اور پھر اگر بتیاں بجھا دیں۔ سب فوراً سے بھی پیشتر دائروں سے باہر نکل آ گئے۔

''تمہیں مبارک ہو ہیبت خان کہ بلا تمہارے سر سے ٹل گئی ہے۔'' محمد حنیف نے ہیبت خان کو مبارک دیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔'' ہیبت خان بولا۔

''نہیں اس رب کا شکر ادا کرو۔'' محمد حنیف بولا۔ ''اللہ تعالیٰ عزوجل ہر انسان کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور بناتا ہے۔ اب کبھی بھی اس گھر کے اندر کوئی ایسا واقعہ نہ ہونے دینا۔ اللہ کے کلام کی تلاوت جس قدر زیادہ اس گھر کے اندر ہو گی۔ شیطانی طاقتیں اس تیزی سے اس گھر سے دور بھاگیں گی۔''

''انشاء اللہ۔'' ہیبت خان نے جواب دیا۔

ہیبت خان دونوں بچوں، منشی اور محمد حنیف کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے اندر داخل ہو گیا اور سب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ نماز فجر کا ٹائم ہونے والا تھا۔ محمد حنیف نے انہیں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور سب ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ (ختم شد)

☆......☆......☆